شعبۂ اردو ، جامعۂ کراچی

یونس حسنی

بلقیس شاہین

شاہدہ تبسم

ابوالخیر کشفی

جمیل اختر

یونس حسنی

ابواللیث صدیقی

مانک رام

غلام مصطفیٰ خاں

منظور حسین شور

اسلم فرخی

سحر انصاری

کان کا گایا

سعود احمد دہلوی

...باقی

...دہلوی

محمد ہادی حسین

ابوالخیر کشفی

رفتار

ترتیب دینے والے

ابوالخیر کشفی
جمیل اختر
یونس حسنی

شعبۂ اردو ، جامعہ کراچی

تاریخ اشاعت ———— ربیع الاوّل سنہ ۱۴۰۰ھ

تعداد ———— ایک ہزار

کتابت ———— محمد مہدی / شوکت علی

طباعت ———— شیخ شوکت علی اینڈ سنز

ناشر ———— ابوالخیر کشفی

قیمت ———— دس روپے

طلباء کے لئے ۵ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفتار نما

(۱)

ہر اک بیاں سے پہلے

(۲)

گوشۂ جوہر

(۳)

یافت و بازیافت

(۴)

ایک کتاب دو نقاد

(۵)

ہر اک بیاں سے پہلے

- تابش دہلوی
- محمد ہادی حسین
- ابوالخیر کشفی

تابش دہلوی

خاکِ ارجمند

لولاکَ لَماخلقتُ الافلاک
گونجی یہ ندا فضائے ہو میں
اک نور تھا جلوہ گر سرِ خاک
عالم تھے ہزار ہا نمو میں

اِس نور سے خاک کو شرف ہے

اس نور سے دو جہاں ہیں پر نور
یہ ایک گہر صدف صدف ہے
یہ جلوہ گری ہے طور در طور

اِس نور سے سوزِ جاں ملا ہے

سرچشمۂ زندگی ہے یہ سوز
تقویم حیات بن گیا ہے
یہ مہر، یہ ماہ، یہ شب و روز

ذرّوں کو نصیب خاوری ہے

غلطاں گلِ تر میں ہیں گلستاں
پستی کو غرورِ برتری ہے
قطروں میں نہاں ہیں لاکھ طوفاں

ہر دل میں ہے عشق کا شرارہ

آسودۂ حسن ہر نظر ہے
ہر ذرہ ہے عرش کا ستارہ
وہ حسنِ ازل جو جلوہ گر ہے

تا عرش رسا ہوئی کفِ خاک

افلاک سے بھی ملی بلندی
لولاک لما خلقت الافلاک
اے خاک تری یہ ارجمندی

تابش دہلوی

نعتِ رسولؐ

مجھے توفیق دے یارب کہ نعتِ مصطفیٰؐ لکھوں
قلم جنبش میں آئے اور میں صَلِّ عَلیٰ لکھوں

محمدؐ مصطفےٰؐ لکھوں، حبیبِ کبریا لکھوں
محبت کا تقاضا ہے انہیں اس سے سوا لکھوں

ازل کی آرزو لکھوں، اَبد کا مدعا لکھوں
محمدؐ ابتدا لکھوں، محمدؐ انتہا لکھوں

دلِ تاریک انساں کو منوّر کر دیا آقا
تمہیں بدرالدجیٰ لکھوں، تمہیں شمس الضحیٰ لکھوں

یہ خاکِ پاکِ طیبہ ہے یہاں سرکار رہتے ہیں
اُسے آنکھوں کا سرمہ، دل کے زخموں کی دوا لکھوں

بڑی سرکار ہے اُن کی وہ سردارِ دو عالم ہیں
انہیں داتا لکھوں اور خود کو محتاج و گدا لکھوں

خدا کو میں نے پہچانا، محمدؐ کے حوالے سے
انہیں کو حق رسا جانوں، انہیں کو حق نما لکھوں

عطا کیجے زباں قدسیؒ و حسّانؓ اے مولا
بہت دن سے تمنا ہے قصیدہ آپ کا لکھوں

محمد ہادی حسین

نعتِ رسولؐ

مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے   یقیں کیا چیز ہے ، عین الیقیں ہے
محمدؐ رحمت للعالمیں ہے

بہت گزرے ہیں انساں کے مخیّر   کوئی منذر تھا اور کوئی مبشّر
وہ محسن تھے یہ خیر المحسنیں ہے

کلیم اللہ و روح اللہ تھے اور   یہاں اعجاز کا ہے اور ہی طور
یہاں اعجاز قرآنِ مبیں ہے

وہ کارِ عرش کا انجام قرآں   خدا کا آخری پیغام قرآں
وہ خود برہانِ ختم المرسلیں ہے

کیا قرآن نے کارِ خدائی   صراطِ مستقیم اُس نے دکھائی
وہ دنیا میں سراج السالکیں ہے

عجب شے ہے یہ شہکارِ ازل بھی   کہ مقطع بھی ہے اور بیت الغزل بھی
غزل وہ آسماں جس کی زمیں ہے

سمجھنا ہو کلامِ آسماں کو   تو دیکھو شاہِ خوبانِ جہاں کو
کہ وہ خود اُس کی تصویرِ حسین ہے

یہ وہ تصویر ہے جس کے خد و خال   اُس آفاقی مرقّع کا ہیں اجمال
کہ جو مجموعۂ دنیا و دیں ہے

وہ مجموعہ ہے جس کا نام اسلام   فلاحِ دو جہاں کی دعوتِ عام
وہ دعوت جس کا ہر مسلم امیں ہے

تم اے اقوامِ عالم کے اماموں   مسلمانو! اسے مضبوط تھامو
نظامِ مصطفےٰ حبل المتیں ہے

ابوالخیر کشفی

اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

نجم سحر آسمان پر چمک رہا تھا، ستاروں کی چمک، دل کا اجالا، افق پر صبح کے آثار —— ان میں کوئی کشمکش نہ تھی —— یہ سب روشنیاں ایک ہو گئی تھیں —— رات کی ظلمت سیماب پا ہو چکی تھی اور آسمان سحر کے نور سے آئینہ پاش ہو چکا تھا اُس وقت گنبد خضریٰ نظر کے سامنے چمکا —— ہرے رنگ میں سارے رنگ اور سارے منظر جاگتے اور سوتے ہوئے —— کتنے ہی ایسے منظر اور رنگ تخلیق مسلسل کے سانچے میں پگھلتے ہوئے جن کا کوئی نام دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔ گنبد خضریٰ کی آغوش میں ایسا نور کہ قلب مسلماں جس کا ایک عکس ہے آسماں پر نجم سحر، مدینہ کی گلیوں میں وہ نسیم رقصاں کہ جس میں انفاس عشاق کی خوشبو، رنگ بن کر دکھائی دے رہی تھی —— اور دل کی زمین میں آرزو کے پودے میں تمنا کے کھلتے ہوئے پھول ——

میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آسمان کو جھک کر گنبد خضریٰ کا بوسہ لیتے دیکھا ہے۔ میں، جو عالم اصغر ہوں —— میں، جس کی نظر دل وجود کو چیر کر ماضی کو مستقبل کا ہمسایہ بنا دیتی ہے —— مگر میں، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا، خاص طور پر جب ذکر اُن ﷺ کا ہو جو میری پہچان ہیں —— میں لفظ بار کر دلوں اور ذہنوں کو فتح کرتا رہا ہوں۔ میں نے الفاظ کی تہی نفسی دیکھی ہے جو گزرے

ہوئے لمحوں کو بھی زندہ کر جاتے ہیں ــــ لیکن یہ الفاظ اُس منظر کی تاب نہیں لا سکتے ــــ مگر میرا یہ گونگا سا شعر آپ سن ہی لیں - یہ مجھے صرف اسی لئے عزیز ہے کہ جب دید کا غنچہ چٹکا تھا تو ہونٹوں پر اُس کی مہک اس شعر کے قالب میں ڈھل گئی ــــ

افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہِ شاہِ مدینہ مرے آگے

کراچی میں یوسف عباس ہاشمی صاحب نے فندق بہا الدین کا نام بتا دیا تھا - یہ ہوٹل مسجد نبوی ؐ سے ملا ہوا ہے - ہوٹل میں سامان رکھا اور وضو کر کے نیچے اترا تو اپنے آپ کو مسجد نبوی کے روبرو پایا - اب میں آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور اس آئینے میں میرے مقابل تمام داغ عیوبِ برہنگی تھے - اپنی زندگی کی ہر شکن میرے سامنے تھی ــــ میری نگاہیں جھک گئیں - ہمت کر کے پھر نگاہیں آئینے کی سمت اٹھائیں ــــ اس آئینے میں میرے سارے داغ موجود تھے اور ان داغوں کے درمیان میرا دل تھا ــــ سیاہ ــــ ہوس لالۂ نعماں سے داغ داغ - مگر اِن داغوں کے درمیان ایک روشن نقطہ تھا دیکھتے دیکھتے یہ نقطہ بڑھتا گیا ــــ روشن تر ہوتا گیا ــــ داغ مدھم پڑ گئے اور مجھے خود بخود معلوم ہو گیا کہ یہ عشقِ محمدؐ کا وہ نقش تھا جو ہر مسلماں کی طرح میرے دل میں بھی موجود تھا اور جسے مسجد نبوی کے آئینے نے مہر صفت بنا دیا - اور آئینے نے مہر صفت دل بلکہ مہرِ درخشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا -

اور پھر میں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے صحن میں پایا ــــ میں جو آدابِ عشق سے ناواقف تھا، اور جس نے یا محمدؐ کے نعرے لگائے تھے اور اس نام کے ساتھ جب کبھی گریہ گلوگیر ہوا تھا تو میں نے ہمیشہ اپنی چیخیں

سنی تھیں، اُس صبح اُس بارگاہ میں اویس وجنید و بایزید کی روایات کا امین تھا ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ ایسی سچائی ہے جسے سب ہی مان لیں جیسے یہ سچائی کہ اسم محمدؐ کے بغیر عہدِ حاضر ایک خرابہ ہے، جیسے یہ بات کہ آدمی جنم جنم سے بہت پیاسا ہے

نمازِ صبح سے فارغ ہو کر میں نے روضۂ رسولؐ کی طرف اپنے قدم بڑھائے مگر میرے بیتے ہوئے شب و روز نے میرے قدم جکڑ لئے —— میں "روضۂ من ریاض الجنۃ" میں داخل ہوا اور میں نے تارِ نظر کو آنسوؤں کے موتیوں سے صاف کر کے تلاوت شروع کر دی —— قرآن حکیم میں وہ مقام سامنے آیا جس میں حضورؐ کے رؤفؐ رحیم ہونے کا ذکر ہے —— اور یوں صدیاں پل بھر میں سامنے سے گزر گئیں —— اور ہر صدی اُس کے رؤف رحیم ہونے کی ایک گواہی تھی —— یہ وہ ذات ہے جو کفار کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کرتی —— یہ حضورؐ کی محفل ہے اور اس چاند کے گرد ستاروں کا حلقہ ہے اور کوئی اجنبی آتا ہے تو پوچھتا ہے کہ "تم میں سے محمدؐ کون ہیں" ——

میں ریاض الجنۃ سے باہر نکلا اور اب میں روضہ رسولؐ کی طرف خود نہیں بڑھ رہا تھا میرے کندھوں پر ایک ہاتھ تھا —— ایک ہاتھ جو اس پوری کائنات پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہے۔

اور اب میں مرقد خاتم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے کھڑا تھا۔

ایک طرف صدیق اکبرؓ سو رہے ہیں —— صدیق اکبرؓ گواہی دینے والے مردوں میں سب سے پہلے، غار میں دوسرے، میدان بدر میں چراغ نبوت کے لئے

دامانِ حفاظت (باذنِ رب) اور اب ابدی خواب گاہ میں شریک ؎

ہمت او کشت ملت را چو ابر

ثانیؓ اسلام و غار و بدر و قبر

اور اس پر اضافہ کیجئے ثانیؓ حشر کا۔

دوسری طرف فاروقِ معظمؓ دامانِ رسولؐ میں محوِ خواب ہیں۔

مکہ معظمہ میں مجھے یہ بات بہت THRILLING معلوم ہوئی تھی کہ مغرب کے وقت جب حرمین کے مؤذن اللہ اور اس کے رسولؐ کی توحید و رسالت کی گواہی دیتے ہیں تو لوگ وقت کو ناپتے ہیں اور اپنی گھڑیاں ملاتے ہیں۔ کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے برادرم خورشید احمد نے مجھے ایک رسالہ سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر کے ایڈیٹروں میں شامل کر کے ایک سعادت میں شریک بنا دیا تھا۔ اس قرآن نمبر کے کئی مضامین پر نظرِ ثانی اور معیار سازی کا کام میں کر چکا تھا، لیکن خود مجھے دو مضامین لکھنے تھے —— حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر قرآن حکیم کی روشنی میں مضامین ۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کا رشتہ ایسا ہے کہ صرف خاموشی کسی قدر اسے سہار سکتی ہے اور آنکھیں آنسوؤں کے وضو کے ذریعہ کسی حد تک اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔ میں ہزار کوششوں کے باوجود کراچی میں حضور سرورِ کونینؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ایک سطر نہیں لکھ سکا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ مجھے اس تحریر کے آغاز کے لیے اپنے دروازے پر بُلا کر میرے عشق کو اعتبار کی سند عطا کر دیں گے۔

پہلے دن نمازِ فجر کے بعد روضۂ مبارک پر جو کچھ بیتا وہ مجھے یاد نہیں، اور اگر یاد بھی ہے تو اُس کا تعلق حرف و بیان کی دنیا سے نہیں۔ سامنا کس کا تھا، وہ جو قرآن کے حروفِ مقطعات کے نقاب میں چھپ کر بھی کس درجہ نمایاں ہے۔

وہ جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی —— وہ جو وقت کا عیار ہے ——

ازل سے ابد تک سارا مرحلہ اُس کے لئے ایک سانس کی مسافت ہے۔

ظہر کے بعد میں پھر سلام کرنے حاضر ہوا —— حضرت صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ اپنے صدق کا کروڑواں حصہ اپنے رب سے کہہ کر مجھے عطا کر دیجئے تاکہ میں زبان کھولوں۔

اور پھر میں نے حضور آیۂ رحمت اپنی نظم پیش کی۔

"نبی محتشم! ترا گدائے بے نوا کشفی
بچشمِ نم ترے دامن کا سایہ ڈھونڈنے آیا"

اور پھر اُس کے حضور اپنا ایک ایک گناہ یاد آیا۔

"اِدھر میں ہوں کہ اکثر جسم کے جھوٹے تقاضوں پر
حدودِ شرع کو توڑا
کبھی اپنی ہوس کو پیکرِ شعر و سخن دے کر
متاعِ عمر ضائع کی
مگر تیری ثنا عمرِ پشیماں کی نئی منزل"

اور یوں ہی بے آواز! لب ہلائے بغیر، خاموشی کو کلام کے سانچے میں ڈھال کر دو تین سو مصرعے میں نے نذرانہ کے طور پر پیش کئے —— نظم کے "شاعرانہ مرتبہ" بلکہ فرومائگی کو شاید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا —— مگر اُن لمحوں نے اس نظم کو میرا استغاثہ بنا دیا —— مصر کے بازار میں ایک بڑھیا سوت کی انٹی لے کر یوسف کی خریداری کے لئے نکلی تھی —— مگر میں نے تو ان لفظوں سے اپنے گلے کے لئے طوقِ غلامی تیار کیا تھا —— یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ غلامی کا پٹا ہیں —— وہ پٹا جو کوئے محمدؐ کے اس دربان کے گلے میں میثاقِ ازلی کے تمغہ کی طرح چمک رہا ہے جس کا نام ابوالخیر ہے —— مگر اُس گھڑی میرا کوئی نام نہیں تھا میں تو بس اُسی کوچے کی مٹی کا ایک ذرہ تھا —— وہ ذرہ جو جوہر ہے —— وہ جوہر جو اس آفاق کے پردوں سے گزر سکتا ہے۔

عصر کی نماز کا دامن نمازِ ظہر سے بندھ ہو گیا ——— یہ پوری مدت حرم مصطفیٰؐ میں گزری ——— گرمی کی وجہ سے جب دُر" باز سپاہیوں کو نیند آئی تو میرے لب روضہ کی جالیوں پر تھے ـــ میری آنکھیں بند تھیں اور ان بند آنکھوں پر آنسوؤں کی جھالر کے پیچھے زماں و مکاں، یہ اور وہ سب دم بخود کھڑے تھے ـ صدیاں گزر گئیں اور حرم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشیوں کو کوئی آواز مجروح کرنے کی جرأت نہ کر سکی - اور یہ خاموشی ایک مرکز تھی ——— اس مرکز کے گرد ایک دائرہ کھینچا ہوا تھا ——— یہ دائرہ آوازوں سے معمور تھا ——— درود و سلام کی آوازیں - وہ آوازیں جو صدیوں سے حرم مصطفیٰؐ کی فضاؤں کا طواف کر رہی ہیں ـــ آوازیں تو ہماری طرح مجبور نہیں ——— آوازیں تو فضا کا حصہ بن کر جاودانیت کا لبادہ پہننے کے بعد تکلیفاتِ شرعیہ سے بلند تر ہو جاتی ہیں ——— وہ تو رقصِ عاشقانہ اور طواف مستانہ کر سکتی ہیں حضورؐ! "عاشقانہ" اور مستانہ کے ٹکڑوں کے لئے مجھے معاف کر دیجئے ——— میں بے نوا ہوں ——— سچ مچ بے نوا ——— میرے دامن میں تو آپ کے لئے لفظ بھی نہیں ہیں ـــ ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپ نے ابوبکر کو دیکھا تو وہ صدیقؓ ہو گئے، عمرؓ پر آپ کی نظر پڑی تو وہ فاروقیت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے یا عثمانؓ آپ کی بزم میں آئے تو ہوا یہ کہ "ہر دو جہاں سے بے نیاز اُس کا دلِ غنی" ——— علیؓ آپ کے سینے سے لگے تو باب العلم ہو گئے ——— سرکارؐ! عاشقانہ اور مستانہ کے لفظوں کے ماتھے پر اپنی خاک پا مل دیجئے تو یہ لفظ ستارے بن جائیں۔

میرے سینے سے بھی ایک نوا بلند ہوئی جو اُنؐ کی نسبت سے نوائے سینہ تاب بن گئی اور اُن جاوداں آوازوں کے حلقے میں شامل ہو گئی جو مرکزِ عشق کے گرد کھینچا ہے۔ صدیوں بعد کوئی آئے گا اور میری آواز اُس کے ہونٹوں سے اُبھرے گی اور اُس کی آنکھوں سے ٹپکے گی۔

مغرب کی نماز کے بعد میں نے "عکس محمدی قرآن کے آئینے میں" کا ابتدائیہ خوابگاہِ رسول ازل و ابد کے سرہانے بیٹھ کر لکھا۔ یہ تحریر شائع ہو چکی ہے اور اب میں اسے نئے سرے سے دوبارہ لکھ چکا ہوں۔ ستر اسی صفحات کی تحریر اب چار سو صفحات سے بھی آگے بڑھ گئی ہے مگر اس تحریر کے ابتدائیہ کو نقل کئے بغیر آگے کیسے بڑھوں۔

"سعودی عرب میں مغرب کے وقت جب مؤذن بیت اللہ اور مؤذن مسجد نبوی کے ہونٹوں پر اللہ کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دعوتِ صلوٰۃ و فلاح میں آتا ہے تو وقت کی رفتار کا اندازہ کیا جاتا ہے، اور گھڑیاں اس آواز پر اُسی طرح متحد ہو جاتی جس طرح اِن دونوں عناصر (توحید و رسالت) نے دنیائے اسلام کو متحد کر رکھا ہے۔

"یہ آواز چودہ صدیوں سے گونج رہی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کائنات میں

؎ محمدؐ کا اب تک دھڑکتا ہے دل

اور یہ دل ہمیشہ دھڑکتا رہے گا۔

"یہ نام چودہ سو سال کی مدت اور عہدِ حاضر کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نام، یہ اسم گرامی جو ایک زندہ وجود ہے، اور سارے کرۂ ارض میں بسنے والے اہل ایمان کے لئے زندگی کی علامت اور تحریک بھی ہے۔ یہ علامت اور تحریک بیت اللہ سے دنیا کے ہر گوشے تک پھیلی ہوئی ہے — یہ نامؐ ابر کرم کی طرح گنگا سے ٹیگس تک ہر جگہ برس رہا ہے۔ قرآن نے "سیروا فی الارض" کی تعلیم دی ہے اس سے ایک طرف تو "عاقبۃ المکذبین" سامنے آجاتی ہے اور دوسری طرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاس پاک اور زندگی بخش آثار کے حقائق روشن ہو جاتے ہیں۔ صبح تاروں کی چھاؤں میں صلوٰۃ و درود کا

سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور وقت کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے کسی گوشے میں صلوٰۃ و درود کے ہدیے نہ پیش کیے جائیں ۔ حضورؐ کے روضہ مبارک کے سرہانے کھڑے ہو کر افریقہ، ایشیا، امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے ہر ملک اور خطّے کے لوگ اپنی روح کے ساز پر یہ نغمہ فرشتوں کی ہم نوائی میں رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ

"سلام و درود سید الکریم پر،

اے رسولِ عظیم! اے رؤف و رحیم!

آپ پر اللہ کی برکتیں ہوں

اے وہ کہ تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور اللہ کا آخری پیغام!

اللہ اور فرشتوں کے سلام میں ہم بھی شریک ہیں۔

اے نورِ عرش ! اے خیر خلق اللہ!

اے رحمۃ للعالمین ! تجھ پر لاکھوں سلام

اے یٰسٓ ! اے طٰہٰ ! اے بشیر

اے سراجِ منیر! ہمیں مایوس نہ فرمانا۔

قیامت کے دن تیرے علَم کا سایہ ہمارے سروں پر ہو

" یا رسول اللہ! ہم اپنے ایمان کی ساری کمزوریوں کو جاننے کے باوجود گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا، اس طرح جو عظیم ترین رسولؐ کے شایاں تھا، اور ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ جو فریضہ آپ نے امت کے سپرد کیا تھا اسے ہم اچھی طرح انجام نہیں دے رہے ہیں۔

"اے سلطان الانبیاء و مرسلین!

تیری عظمت کی سوگند کہ ہم اپنی زندگی

کے نقشے کو بدلنے کی کوشش کریں گے"

مدینہ کے قیام کے دوران بیشتر وقت مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گزرا، مگر افسوس یہ قیام اتنا مختصر تھا کہ مسجد نبوی میں چالیس نمازیں بھی پوری نہ ہو سکیں — فجر کی نماز کے بعد تین چار روزہ قیام کے دوران گرد و نواح کے آثار دیکھنے نکل جاتا۔

"جنت البقیع" کی خاک میں وہ وجود محوِ خواب ہیں، جو ہمارے وجودوں میں زندہ ہیں —— زندگی یکتا ہے، اُسے تکرار کی خُو پسند نہیں ؎

پسند اس کو تکرار کی خُو نہیں

کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

لیکن یہاں سوال تکرار کا کب ہے؟ یہ عثمانِ غنیؓ آسودۂ خواب ہیں —— ہر آنکھ کی حیا، عثمانِ غنیؓ کی حیا کا ایک جلوہ ہے، جلوۂ متواتر، جلوہ پیہم، —— خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ کے مزار پر حاضری دی تو خیال آیا کہ فاطمہؓ تو مرتبۂ امومت کا نام ہے جو زندہ و باقی ہے، اور جس سے خاندان عبارت ہے —— خاندان جو معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے —— فاطمہؓ ایک وجود کا نام بھی ہے اور حسنؓ و حسینؓ کے نقشِ قدم کو اپنانے والوں کی تخلیق کا مرحلۂ دوام بھی ہے —— حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اپنا سلام پیش کرنے سے پہلے میں نے بیگم کلثوم جیلانی اور ممتاز جعفری کا سلام پیش کیا —— میرا دل تو چاہتا تھا کہ میں اُن سے پوچھوں کہ آپ تو خاتونِ جنت ہیں —— ذرا میرے بچوں کے بارے میں تو مجھے بتایئے - میرا عزمی کیسا ہے؟ میرا اسامہ کیسا ہے؟ آپ انہیں ڈھیر سا پیار کرتی ہیں نا؟ —— میرے بچے علی اصغر کے ساتھ کھیلتے ہوں گے؟ اور روزِ حشر وہ آپ کی انگلی پکڑے ہماری پیشوائی کریں گے اور آپ سے کہیں گے کہ بی بی اماں! یہ ہمارے ابو ہیں -

انہیں معاف کرا دیجئے نا —— اور پھر —— مگر میں اموست کے زمزم میں نہا گیا — ہونٹ کھولنے سے پہلے ہی میں خود عزمی اور اسامہ بن گیا اور پھر جنت البقیع میں میرا بچپن کھڑا تھا —— اور میرے بچپن کی وسعت میں باغ جنت کا کتنا بڑا ٹکڑا آ گیا — اور اُس پر گھٹا برسنے لگی اور پھر کھل گئی —— پھر جو خوشبو پھیلی اُس میں سب سے نمایاں خوشبو خاتون جنت کے وجود کی خوشبو تھی —— وہ عطر جسے مجموعہ کہا جاتا ہے خوشبو کی پہلی لہر آئی۔ اُس میں شفقت رسالتؐ کے سارے رنگ تھے —— پھر مجھے اپنی جدۂ ماجدہ کے ہاتھوں میں جو کی روٹی کا ٹکڑا نظر آیا اور پھر انہوں نے وہ ٹکڑا مجھے عطا کر دیا — یہ وہ لمحہ تھا کہ میری خاک کے چھپے ہوئے فقر کا شرارہ بیدار ہو گیا —— اور اُس لمحہ سے آج تک یہ اُسی لقمہ کا اثر ہے کہ جس نے میرے منہ پر تھوکا، میں کلمۂ طیبہ پڑھتا ہوا اُس کی مجبوری کے سینے سے اتر آیا۔

جنت البقیع میں قبروں پر آثار نہیں ہیں، کتبے نہیں ہیں — شریعت کے تقاضے برحق، مقبرے نہ بنائے جائیں — درست، قبریں کچی رہیں —— لیکن ناموں کی تختیاں تو لگائی جا سکتی ہیں —— کینڈی نے امریکہ کا صدر بننے کے بعد آئرلینڈ میں اپنی جڑوں کی تلاش شروع کی —— اور ہم تو جب اپنے آپ کو اپنے دیس میں تلمی پودے سمجھنے پر مجبور کئے جاتے ہیں تو جنت البقیع کا رُخ کرتے ہیں —— ہماری جڑیں یہاں ہیں مگر —— دوستو! اب مقام سکوت و حیرت ہے۔

میرے ساتھ ساتھ سوڈانی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا — اُن کے رہنما نے ایک مقام پر اُن سے کہا کہ "یہ امام زین العابدین کی قبر ہے" —— اور گروہِ مسلین نے فاتحہ پڑھا۔ چند قبروں کے بعد اُس گائڈ نے ایک دوسری قبر کو امام زین العابدین کی قبر قرار دے دیا، اور اُن سادہ لوح مسلمانوں نے دوبارہ اُسی عقیدت سے فاتحہ پڑھی۔

—— اب میں کس سے پوچھوں کہ میرے جد کی قبر کہاں ہے؟ میرا وہ جد جو حسین ابن علی، فاطمۃ الزہرا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے وہ قطرۂ خون

ہے جو میرے رگِ گلو میں ہے۔

ویسے تو یقین سے یہ بات معلوم ہے کہ حضرت زین العابدین کی قبر جوارِ فاطمہ رضؓ میں ہے لیکن یہاں تو بات ایک سوال کی ہے۔

جنت البقیع میں اپنے چبوترے کی بناء پر حضرت عثمان غنیؓ کی قبر کے آثار خاصے نمایاں ہیں —— یہاں وہ سو رہا ہے جس کے خون نے قرآنِ کریم کے صفحات کو گلنار کر دیا۔ جس نے اپنے خون کو قرآن کے ورق ابد آثار کے حوالے کر کے حرمتِ دیارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچا لیا —— قرآنِ حکیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودہ صورت میں ایک مُرتّب کتاب کے طور پر ملتِ مُسلمہ کے حوالے کر کے اللہ کے پیغام کی تکمیل فرمائی ——
حضرت عثمان نے قرآنِ حکیم کی سورتوں کو خود جمع نہیں فرمایا، بلکہ قرآنِ حکیم کو وسیع سلطنت میں یوں پھیلایا کہ اُس کے ہر نقطہ پر امت کا ایمان ہے، اور یوں وہ جامعِ قرآن ٹھہرے عثمانِ غنیؓ ذوالنورین ہیں —— ایسے چاند کسی اور کے صحن میں کب طلوع ہوئے تھے —— اور پھر نورِ قرآن جو ہالہ بن کر حضرت عثمان رضؓ کی قبر کے گرد چمک رہا ہے۔

بی بی سعدیہ حلیمہؓ بھی جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خوش نصیب آنکھوں نے خورشیدِ رسالت کی اولین کرنوں کا جی بھر کر نظارہ کیا تھا۔

ایک صبح میں نے ٹیکسی پکڑی —— ڈرائیور صاحب اُردو خوب بولتے تھے حج کے دنوں میں معلم —— باقی دنوں میں گائڈ اور "صاحب سیارہ" —— اُن کی ٹیکسی میں نواحِ مدینہ میں اپنی تاریخ کے مشاہدے کے لئے نکلے —— میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ میں سب سے پہلے میدانِ احد دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ شہدائے احد کے حضور اپنا سلام پیش کر سکوں۔

یہ میدانِ احد ہے —— شہدائے احد کے مزار پر دور سے ہی سلام پیش کیا۔ قریب جانے کی اجازت نہ تھی —— معلوم نہیں کیوں ؟ —— یہی وہ خاک ہے جہاں عمِ رسولؐ، حضرتِ حمزہ رضی اللہ عنہ دفن ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر جلیل القدر صحابی کے نقوشِ قدم ہمارے لئے رہنمائی کے ستاروں کی طرح ہیں — لیکن خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت حمزہ، حضرت ابوذر غفاری، حضرتِ بلال حبشی، حضرت سلمان فارسی، حضرت خالد بن ولید، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت کعب بن مالک، حضرت سعد بن وقاص، حضرت ابو دجانہ، حضرت زیاد بن سکن، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زبیر اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نام اور زندگی کے واقعات میرے لئے اسلام کے قرونِ اولیٰ کے کوہِ ندا کی وہ چوٹیاں ہیں جو مجھے اپنی طرف بلاتی ہیں اور جن کی آوازوں کی بازگشت میں اپنی روح کے نہاں خانوں میں سنتا ہوں

یہ حضرت حمزہ ہیں — شکار سے واپس آئے ہیں — سارا دن صحرا کی گرد میں شکار کا تعاقب کیا ہے — چہرے پر غازۂ گردِ صحرا ہے — عقابی آنکھوں کی چمک کے سامنے نظر نہیں ٹھہرتی — کنیز بتاتی ہے کہ "آج آپ کے بھتیجے کے ساتھ ابوجہل نے گستاخی کی ہے"۔ — گھر کی دہلیز پر قدم رکھے بغیر حمزہ خانہ کعبہ کا رُخ کرتے ہیں۔ صحن کعبہ میں ابوجہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ حلقہ جمائے بیٹھا تھا — حمزہ کی آواز گونجی - آواز جس میں تلوار کی کاٹ تھی — "سن لے۔ حمزہ مسلمان ہوگیا — اب جو آنکھ محمدؐ کی طرف برے ارادے سے اٹھے گی، حلقۂ چشم سے نکال لی جائے گی۔"

اور پھر مدینہ کی اسلامی ریاست قائم ہوئی اور وہ معرکہ پیش آیا جسے قرآن نے "یوم فرقان" قرار دیا ہے — اُس معرکۂ بدر میں کفار مکہ کے کتنے ہی اکابر شمشیرِ حمزہ جگر دار کے گھاٹ اُترے - ان میں ہندہ کا باپ عتبہ تھا، جبیر بن معطم کا چچا تھا — اور جب بدر کی شکست کے انتقام کے لئے کفر کی طاقتیں احد کے میدان میں جمع ہوئیں تو ہند نے جبیر کے غلام وحشی کو حضرتِ حمزہ کو شہید کرنے پر آمادہ کیا — وہ نیزہ زنی میں فرد تھا — اور حمزہ کی شہادت کی قیمت اُس کی آزادی ٹھہری — حضرتِ حمزہ اسی غلام کے نیزے سے شہید ہوئے - ہند نے اُن کا کلیجہ چبانے کی کوشش کی —

میری نظروں کے سامنے شہدائے احد کا مدفن تھا اور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی

تھی ـــــ احد کی تاریخ جو میری تاریخ ہے ـــــ اور میں نے صدیوں کا سفر پل بھر کر لیا ـــــ حضرت ابن نضرؓ کا اسم گرامی لوحِ ذہن پر چمکا ـــ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ میدانِ احد میں عام ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مایوسی کے عالم میں تلوار پھینک دی ـــ ابن نضرؓ نے کہا "عمرؓ! یہ کیا کرتے ہو ـــ دوست اب جی کر کیا کریں گے حضورؐ کے بعد زندگی زہر ہے شہد نہیں"

ابن نضرؓ کے الفاظ نے ایک طرف تو فاروقِ معظم کو اپنی ذات تک دوبارہ پہنچا دیا اور دوسری طرف وہ صفِ دشمناں میں اس شان سے لڑے کہ جسم نے تلواروں اور نیزوں کے اسیؓ سے زیادہ زخموں کا استقبال کیا۔

غزوۂ احد کا ہر لمحہ جاں نثاری اور جاں سپاری کی کئی صدیاں اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے ـــــ حضور سردارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار فضا میں بلند کی اور فرمایا۔ "اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا" ـــــ شمعِ رسالتؐ کے پروانے آگے بڑھے ـــــ دیوانہ وار ـــــ مگر اُس تلوار کا حق ادا کرنے کی سعادت حضرت ابودجانہؓ کے حصہ میں آئی ـــ دشمنوں کی صفیں درہم برہم کر کے جب دور تک پہنچ گئے تو ہند سامنے گئی۔ خوف کے مارے اُس کا رنگِ رخ زرد ہو گیا۔

ابودجانہؓ نے کہا "جا، سامنے سے ہٹ جا ـــــ یہ رسولِ رب العالمینؐ کی تلوار ہے۔ یہ عورت کا خون نہیں بہا سکتی"

اور یہیں اسی میدان میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد دشمنوں نے گھیرا ڈال دیا تو آپؐ نے فرمایا۔

"کون مجھ پر اپنی جان نثار کرے گا"

حضرت زیاد بن سکنؓ پانچ انصاریوں کے ساتھ آگے بڑھے ـــ عرض کیا ـــــ "آپؐ ہمیں اپنی زندگی، اپنے ماں باپ، اور اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہیں ـــ شکر ہے کہ آج ہم اپنے ایمان کی گواہی اپنے لہو سے دیں گے"

"یہ جاں نثار، اللہ کے قہر کی طرح کفار پر لوٹ پڑے ——— نبی اکرمؐ کے گرد کفر کا حصار ٹوٹ گیا ——— اور زیاد بن سکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُحد کی زمین کو شفق رنگ بنا گئے ——— حضرت زیاد خاک پر پڑے تھے یوں جیسے جادہ صد ہزار سالہ کو طے کر کے جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔ فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ——— "زیاد کے لاشے کو میرے قریب لایا جائے" اور جب اُن کا جسم حضورؐ کے قریب لایا گیا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ راہِ ابد کا مسافر زبانِ رسالتؐ سے اسی جملہ کے سننے کیلئے ابھی اس خاک داں سے روانہ نہیں ہوا تھا۔ اب پائے رسالتؐ کی فلک سامانی تھی اور زیادؓ کے لب تھے۔ زیادؓ نے ان قدموں پر اپنے لب رکھے اور یوں تسلیمِ جاں کو زندگیٔ جاوداں بنا دیا ——— یہ بوسہ جنت کے مسافر کا زادِ راہ بنا اور مسافر اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے میدانِ اُحد سے کہا ——— "اے اُحد کے ذرو! مجھے بتاؤ کہ زیاد بن سکن نے تمہارے کس گوشے میں جان دی تھی۔ میں اُس گوشے کی خاک کو اپنے پیشانی پر مل لوں" ——— لیکن احد کے ذرّوں نے مجھے جادۂ توحید کی یاد دلائی اور میں آنسوؤں کے چراغ، جلتے ہوئے روشن چراغ، خاکِ احد کے سینے میں اتارتا رہا ——— کون جانے کہ جس جگہ میں نے یہ چراغ روشن کئے تھے وہی بوسہ گاہِ زیاد ہو۔

ٹیکسی والے کی کرخت آواز نے اُس سفر کے دھاگے توڑ دیے ——— وہ راستے جو میں نے آنسوؤں سے روشن کر کے ماضی سے واپس لے لئے تھے پھر حال کے اندھیروں میں چھپ گئے ———

"اب چلو بھی۔ کب تک کھڑے رہوگے۔ چند ریال دے کر تم دن بھر تو مجھے تنگ نہیں کر سکتے۔"

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ فاتحہ کو مکمل کیا اور دوسری زیارتوں کے لئے چل پڑا ——— جس ترتیب سے یہ مقامات دیکھے وہ تو یاد نہیں ——— اور پھر اُس ترتیب کی کچھ ایسی اہمیت بھی تو نہیں ——— اہمیت تو اُن نقوش کی ہے جنہیں نقوشِ عہدِ رسالتؐ

کہیئے۔ وہ نقوش جو اُس عہد کو ہمارے لئے "حال" بنائے ہوئے ہیں

مسجد قُبا مدینہ منورہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ہے ــــ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر یثرب تشریف لائے تو قبا کے مقام پر کوئی دو ہفتے قیام فرمایا ــــ یہاں سب سے پہلے مسجد تعمیر کی گئی۔ مسجد قبا جو اسلامی معاشرہ میں مسجد کی مرکزیت کا اشارہ تھی ــــ مسجد قبا کے قریب ہی ایک ویران جگہ منافقوں کے انجام کی کہانی آج بھی خاموشی کی زبان سے سنا رہی ہے ــــ مسجد ضرار ــــ جو مسجد کے پردے میں اسلام کے خلاف سازش کا مرکز تھی ــــ پھر سازش یہ کی گئی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسجد میں کسی نماز کی امامت کرا کے عام مسلمانوں کو "دھوکا" دیا جا سکے مگر وحیٔ الٰہی نے اس سازش کو بے نقاب کر دیا ــــ اور مسجد قبا کی بنیاد تو تقویٰ پر رکھی گئی تھی

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْہِ ــــ (سورۂ توبہ: ۱۰۸)

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی تقویٰ پر اوّل دن سے، وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں"

میں نے مسجدِ قبا میں دو رکعت نمازِ نفل ادا کی ــــ مسجد نبوی ہو، مسجد قبا ہو یا مسجد قبلتین ــــ یہاں سجدہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے سجدے کن سجدوں کے وارث ہیں ــــ یہی وہ قطعات ارض ہیں جن پر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرام نے اللہ کے حضور سجدہ کرکے مقامِ عبدیت کو سوز و دردِ آرزومندی سے ہم کنار کر دیا، اور انسان کو یہ کہنے کے قابل بنا دیا۔ کہ

ع مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اسی خاک میں زندہ سجدے چمک رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے سے آئے

والے مسلمانوں کے سجدوں کو ابدیت کا حصہ بنا رہے ہیں۔

اسی مسجد قبا کے قریب ویران زمین مسجد ضرار کی نہیں بلکہ منافقت کی بے ثمری کا اشارہ ہے —— یہ وہ ٹکڑا ہے کہ حضور نبی کریم نے بعض صحابۂ کرام کو اس پر مکان بنانے کی اجازت دی، مگر حضورؐ کے اُن فرماں برداروں اور جاں نثاروں نے یہی کہا کہ " آپ پر ہمارے ماں باپ قربان! مگر ہمارا امتحان نہ لیجئے —— وہ جگہ جہاں کفار نے نفاق کا لبادہ پہنا اُسے ہم اپنی سکونت کی جگہ کیسے بنائیں"

وہ تو رسولؐ کے ساتھی تھے۔ یہاں تو گھاس کی پتیوں اور پودوں نے بھی اُگنے سے انکار کر دیا۔

مسجدِ قبلتین میں دوگانہ ادا کرتے ہوئے یہ بات یاد آگئی کہ تحویل قبلہ کی آیت اُس وقت نازل ہوئی جب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی امامت فرما رہے تھے اور شاید وہ تیسری رکعت تھی —— نماز کے دوران ہی حضورؐ نے بیت المقدس کی سمت سے رُخ موڑ کر سوئے بیت الحرام کر لیا، اور اُسی لمحہ سے یہ قوم "بیت الحرام" کو اپنی سمت سمجھتی ہے۔ اطاعت کی ایسی نظیر تاریخ میں اور کہاں ملے گی ——

تحویلِ قبلہ نے قومِ رسولِ ہاشمی کو قیدِ مقام سے بلند کر کے رضائے الٰہی کا تابع بنا دیا ورنہ قبلہ کو بھی بُت بنا لیا جاتا —— مسجدِ قبلتین میں اس سلسلے میں کتنے ہی نکتے ذہن میں آئے —— بیت اللہ، اس زمین پر خدا کا پہلا گھر ہے، پھر تعمیر ابراہیمؑ ہے اور ہم ملتِ ابراہیمی ہیں —— اس تحویل سے یہ بھی بات اُبھر کر سامنے آئی کہ تحویلِ قبلہ یہود پر کتنا گراں گزرا۔

مسجد قبلتین سے مسجد قبا کے راستے میں چار تاریخی مسجدیں پڑتی ہیں —— اور پھر نواحِ مدینہ میں سات مسجدوں کا سلسلہ ہے جن میں سے اب غالباً پانچ باقی ہیں۔ مسجد سلمان الفارسی، مسجد سیدنا علی، مسجد سیدنا عمر، مسجد سعد بن معاذ، مسجد سیدنا ابوبکر صدیق —— ان سب مسجدوں میں نفل نمازیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہر مسجد

کا نام اُن کی یاد دلاتا ہے جن کی نسبت سے یہ مسجدیں ہماری متاعِ عزیز اور ہمارا عظیم ورثہ ہیں ——— ہم تو سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا علی اور دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سجدوں کے وارث ہیں ——— ان مسجدوں میں سجدہ کرنے والوں کو یہ نکتہ یاد آتا ہے کہ وہ "خاشعین" میں شامل ہوں کیونکہ یہی خشوع اُن کی فلاح کی ضمانت ہے

یہ خشوع اللہ کے حضور سب کچھ بھول جانے کا نام ہے ——— اپنے اعضاء کے سکون کے ذریعے آدمی اس کیفیت تک پہنچتا ہے۔

جنت البقیع سے لے کر ان مسجدوں تک بار بار یہی خیال ذہن کو ستاتا رہا کہ ہم اپنے ملی آثار اور تاریخ کے کیسے مجرم ہیں جن قوموں کے پاس تاریخ نہیں ہوتی وہ تاریخ ایجاد کرتی ہیں اور یوں زماں و مکاں میں جڑ پکڑتی ہیں۔

"GEORGE WASHINGTON SLEPT HERE"

تو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک لطیفہ بن گیا، مگر اس سے اپنی تاریخ سے اقوام کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے ——— آج بھی تو سعودی عرب میں جلالۃ الملک فلاں بن فلاں کے ناموں کی یادگاری تختیاں نصب کی جاتی ہیں ——— پھر اگر جنت البقیع کے سونے والوں کے ناموں کی تختیاں مزاروں پر لگا دی جائیں تو عقائد کی دنیا میں کون سی تباہی آجائے گی؟ ——— حضور سرورِ کائنات کے مولد میں "مکتب" دیکھ کر اگر دل لرز جائے تو یہ ایمان کی علامت ہے ——— اگر زمین کے کسی ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے کوئی کہے کہ یہاں "خانۂ ارقم رض" تھا اور وہاں گدھے بندھے ہوں تو کسی مسلمان کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی؟ ——— یہی تو وہ جگہ تھی جہاں فاروق اعظم رض نے حاضری دے کر اپنے ایمان کا اعلان کیا تھا اور مکہ کی وادیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی تھیں ———

مدینہ منورہ کے آثار اور مساجد بھی اپنی عظیم میراث سے ہماری دوری کی نوحہ خواں ہیں ———

آیئے اس ذکر سے، جو حدیثِ کائنات و تذکرۂ روزگار کی طرح تلخ ہوا جا رہا ہے، گریز کر کے مسجدِ نبوی کا رُخ کریں ——— مسجدِ نبوی جو مدینہ منورہ میں غلامانِ رسولِ عربی ؐ

کی زندگی کا محور ہے اور سارے دائرے اسی مرکز کے گرد کھنچتے ہیں۔ مسجد نبوی ؐ میں قدم رکھنے سے پہلے اس مسجد کے بارے میں آدمی کیا کچھ نہیں پڑھتا —— یہ مسجد جس میں سجدہ کی تمنا بھی مسلمان کی زندگی کی معراج ہے —— مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں ہو وہ ہر نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف رخ کرتے ہوئے جہاں حرم کعبہ کے بارے میں سوچتا ہے وہاں مسجد نبوی کے سبز گنبد بھی نگاہوں کے افق پر ابھرنے لگتے ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ذکر وفکر کے اسالیب میں بھی یہ مسجد شامل ہے

"گنبد خضرا کے مکیں"، سبز گنبد کے مکیں، "اے حرم مصطفیٰ" —— جیسے ٹکڑوں میں ہماری عقیدت نے لفظوں، حرفوں اور آواز کو دل کی دھڑکن عطا کر دی ہے —— حج کے سفرنامے میں نے ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھے تھے —— ان سفرناموں میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے "سفرنامۂ حجاز" کی یاد آج بھی تازہ ہے —— یہ سفرنامۂ حجاز میں نے لڑکپن میں پڑھا تھا —— یہ تذکرے جو کتابوں میں پڑھے تھے، جذبۂ عشق کے طفیل مدینۂ منورہ پہنچنے سے پہلے بھی جیسے نظارہ کی حد تک پہنچ گئے۔

یہ "ستون حنانہ" ہے جس کا سہارا لیکر دنیا کا فصیح ترین انسان خطبہ ارشاد فرماتا تھا۔ یہ ستون عائشہ رضؓ ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ اگر لوگوں کو اس کی عظمت کا پورا احساس ہو جائے تو یہاں نماز پڑھنے کے لئے قرعے پڑنے لگیں —— اور وہ "ستون سریر" ہے جہاں ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام اعتکاف فرماتے تھے یہ "ستونِ وفود" ہے —— یہ جگہ مسجدِ نبوی میں درس گاہِ مصطفیٰ کا درجہ رکھتی ہے —— یہاں حضورؐ شریعت کی تعلیم دیتے تھے —— اور وہ روشن ٹکڑا مقام جبریل ہے —— وہ رہا ستونِ علی رضؓ اور یہ ہے ستون تہجد —— لیکن مسجد نبوی ؐ میں جو بھی لمحے گزرے اُن میں یہ نام ذہن میں بھی نہ آئے —— مسجد نبوی مجموعی طور پر جیسے ذات پر چھا گئی تھی —— یہ مسجد ایک کُل کے طور پر ابھرتی —— ایک وحدت —— اور اس کل میں گم ہونے کے اُن لمحات میں روضۂ شریف کے علاوہ اگر کسی مقام کا احساس ذہن میں

رہتا تو وہ روضۂ جنت تھا۔

مسجد نبوی میں خود فراموشی کے ساتھ بیداری کا عجب سا احساس گھُل مِل جاتا ہے۔ ایک طرف تو حضور آیۂ رحمت اپنے آپ کو گم کردینے کا جذبہ ——— اور دوسری طرف " با محمد ہوشیار" کا احساس ——— یہ جذبہ اور یہ احساس ایک دوسرے کی تکمیل یوں کرتے ہیں کہ دیارِ رسولؐ میں آدمی کو اپنی زندگی پر جریدۂ تکمیل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

مدینہ شریف میں مسجد نبوی کے باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی عہدِ رسالتؐ کی زندگی سے کتنی مختلف ہے۔ جدید ترین طرز کی گاڑیاں سڑکوں پر پھسلتی ہوئی ——— مختلف امصار و ولایات کے لباس، لوگ اور زبانیں ——— لیکن ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نگاہِ رسالتؐ ہمیں دیکھ رہی ہے ——— نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جنبشِ مژگاں تک کے شاہد ہیں ——— اور اس احساس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدینہ کی گلیوں میں وہ شور نہیں جو مکہ میں حرم شریف کی قریبی گلیوں میں سنائی دیتا ہے ——— یہاں جیسے آج بھی ہر صاحبِ ایمان اپنے آپ کو اس حکمِ قرآنی کا مخاطب سمجھتا ہے کہ اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے بلند تر نہ کرو ——— یہ حکم گفتگو کو سرگوشی بنادیتا ہے۔ مدینہ کی کھجور کی شیرینی یہاں کے رہنے والوں کے لہجہ میں بھی ملتی ہے اور یہ اُسی شیریں دہن کے لہجہ اور ذات کا صدقہ ہے جو ہر شیرینی کا معیار ہے۔ مدینہ میں مسجد نبوی کے باہر ان آنکھوں نے یہ دیکھا ہے کہ اگر دو آدمیوں کا لہجہ ذرا تلخ ہوا تو کسی گزرنے والے نے درود شریف پڑھنا شروع کیا، اور لہجہ کی تلخی، سکوت یا نرم گوئی میں بدل گئی۔

ستمبر میں مدینہ منورہ میں دن خاصے گرم تھے اور راتیں بہت خوشگوار اور خنکی آمیز تھیں ——— دن میں، میں اور عاکف عام طور پر کچھ نہ کھاتے، دو تین مرتبہ پھلوں کا رس پی لیتے ——— خربوزہ کا رس یا شربت پہلی بار یہیں پیا ——— یہ شربت

کھانے کی تسکین بھی رکھتا ہے ـــــ ایسا میٹھا خربوزہ زندگی میں کبھی نہیں چکھا تھا لکھنؤ کے خربوزوں پر جو ناز تھا وہ ختم ہو گیا ـــــ اور پھر بہت سے پھلوں کا مکسڈ جوس "ـــــ انار کا رس ـــــ ہر بار رس پیتے ہوئے یہی خیال ذہن میں آتا ہے کہ مدینہ کے پھلوں کو بھی آقائے دوجہاںؐ کے خادموں اور مہمانوں کا کتنا خیال ہے ـــــ اور یہ بھی سوچتا کہ شاید دوسرے ملکوں سے درآمد کئے ہوئے پھلوں کی شیرینی بھی ہوائے مدینہ کی مرہونِ منت ہے

فندق بہاء الدین سے ملی ہوئی ایک "رس دوکان" سے ہم لوگ رس پیتے تھے شاید دوکان کے نوجوان مالک کا نام علی تھا ۔ دو تین دن کے قیام کے دوران ہی علی سے دوستی کا ایک رشتہ قائم ہو گیا ۔ اس کا ثبوت بھی کوئی ڈیڑھ سال بعد عملی طور پر ملا ـــــ اس تذکرہ کے لئے آپ کو واپسی کے سفر کی سرگزشت تک انتظار کرنا ہوگا ۔

وقت شہرِ رسولؐ میں کتنی آہستگی اور کتنی تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا ـــــ آہستہ خرامی ایسی کہ ہر دن ، یومِ تخلیق معلوم ہوتا اور رفتار ایسی کہ ایک لمحہ میں چودہ صدیوں کی مسافت طے ہو جاتی ۔ آخر رخصت کی گھڑی آئی ـــــ وہ لمحہ آیا کہ روضۂ رسول کے سرہانے کھڑے ہو کر پلکوں کی چلمن پر ستاروں کے جھرمٹ میں گم نظر نے مرقدِ رسولؐ کا بوسہ لیا اور ہونٹوں پر فراقیہ بول آ گئے ـــــ یہ الوداعی سلام تھا ۔

الوداع یا رسول اللہؐ

الفراق یا نبی اللہؐ

"اے اللہ کے حبیب ! مجھے اذنِ سفر دیجئے کہ زندگی مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے ! ورنہ تمنا تو یہی ہے کہ گنبد خضرا کی دید ہی زندگی بن جائے ۔

"آپؐ کے اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں میری اس حاضری کو آخری نہ بنائے ، اور مجھے آپ کی بارگاہ میں حاضری کا دوبارہ بلکہ بار بار موقع دے ۔

لیکن اگر میں اس خاک داں سے رخصت ہوگیا تو آج کے دن سے قیامت کے دن تک کے لئے آپ کو اپنی شہادت، اپنی امانت، اپنے عہد اور وعدہ کا امین بناتا ہوں۔

میری شہادت، میرا عہد اور میری امانت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں — اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اس کے رسول اور عبد ہیں۔

الوداع یا رسول اللہؐ

الفراق یا نبی اللہؐ"

گوشۂ جوہر

- منظور حسین شورؔ
- اسلم فرخی
- سحر انصاری
- شاہدہ تبسم
- ابواللیث صدیقی

منظور حسین شور

محمد علی جوہر

وہ دور جب سازِ کلیسا، صورِ اسرافیل ہو
جب اہرمن کے ہاتھ میں بہرِ دعا انجیل ہو
تابوتِ ملک و قوم میں جب سامراجی کیل ہو
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

اقوام کی غیرت ہو جب دامِ کلیسائی کی صید
زنجیرِ استعمار میں جب عظمتِ آدم ہو قید
جب خون ہو تثلیث کے فرزند کا اتنا سفید
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

ملت کی آزادی سے جب لیتی ہیں زنجیریں خراج
جب وحدتِ اقوام سے بیعت طلب ہو سامراج
جب پوچھتی ہیں آندھیاں کعبے کی شمعوں کا مزاج
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

جب سنتِ مشر[illegible] تدعن ہو خدا کا احترام
جب دینِ سلطانی میں غداری ہو آزادی کا نام
جب حکمت و دین و سیاست سب کے سب ہوں زیرِ دام
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ ؛

جب باغباں بھی کم نظر، صیّاد بھی ہو کم نظر
جب دشت بھی نامعتبر، گلشن بھی ہو نامعتبر
جب کوششوں کے بعد بھی کھلتے نہ ہوں اڑنے کو پر
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

اپنا وطن، اپنا لہو، چہرے پہ جب ملنے لگے
اپنے لہو کی آگ میں جمہور جب جلنے لگے
اپنی ہی میت لے کے جب ملت کوئی چلنے لگے
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

غرقاب ہوں جب کشتیاں ساحل بہ ساحل، یم بہ یم
جب قومیت کے خون سے تاریخِ ملت ہو رقم
تثلیث کی صرصر سے تھراتی ہو جب شمعِ حرم
اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

جب سنتِ تثلیث لے روحِ حرم سے انتقام
جب بستۂ زنجیر ہوں کعبے میں کعبے کے امام
جب آفتابِ حشر ہو سایہ فگن بالائے بام

اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

جب اپنے ہی ساحل سے ٹکرائیں سفینے اپنے سر
جب اپنے اپنے آئینے خود توڑ دیں آئینہ گر
جب مجرمِ بے جرم ہو، حوّا ادھر آدم ادھر

اس وقت اک جوہر کا ہوتا ہے علی گڑھ سے ظہور
اس وقت راتوں کو دیا کرتا ہے سورج غسلِ نور

(الحاق)

اے وہ کہ تیری گفتگو تقریر کا اعجاز تھی
تیرے قلم کی ہر صدا تاریخ کی آواز تھی

اسلاف کی غیرت کا تند و تیز دھارا تو بھی ہے
اسلام کے ماضی کا زندہ استعارہ تو بھی ہے

تیری لحد کے ذرّے ذرّے سے یہ آتی ہے صدا
مغرب سے بجھ سکتا نہیں مشرق کی عظمت کا دیا

اسلم فرخی

نذرِ محمد علی جوہر

وہ رہگزارِ محبت میں جادہ پیما تھا
رفیق تھا کبھی ہمدردِ ین کے ابھرا تھا
بساطِ عجز پہ شبنم، وغا میں شعلہ تھا
وہ رہ نوردِ ہمیشہ جو سر بصحرا تھا

وہ مردِ حُر جو اسیری میں بھی رہا آزاد
ہوئی شبیہ سے جوہر کی انجمن آباد

قدم قدم پہ جوابِ حریف توبہ شکن
رئیسِ قوم، امیرِ وفا، تہی دامن
جنوں طرازیٔ فطرت سے شعلہ پیراہن
نظامِ مصطفویؐ کا ستارۂ روشن

خدا نے اس کی دعا کو قبول فرمایا
غلام ملک میں وہ لوٹ کر نہیں آیا

وہ بولتا تو در و بام مسکراتے تھے
گرج اٹھے تو عناصر بھی سہم جاتے تھے
قلم اٹھائے تو الفاظ دوڑے آتے تھے
حروف ابھرتے تھے جولانیاں دکھاتے تھے

وہ حرف و صوت میں یکساں کمال رکھتا تھا
جمالِ فقر میں شاہی جلال رکھتا تھا

وہ مٹ گیا کہ محبت کی آبرو بڑھ جائے
متاعِ فکر و نظر جوشِ آرزو بڑھ جائے

بجھی بجھی ہے فضا ذوق ہاؤ ہو بڑھ جائے
وقار و عظمتِ اسلام چار سو بڑھ جائے

وہ مضطرب کبھی ترکوں کے انتخاب میں تھا
کبھی وہ ڈوبا ہو فکر انقلاب میں تھا

وہ صف شکن، وہ مجاہد، وہ روحِ فکر و عمل
وہ آسمانِ محبّت کا تیرتا بادل
اندھیری رات میں اس کا وجود تھا مشعل
نصیب اُسے ہوئی آغوشِ قبلۂ اوّل

اسی کے نام سے یارب ہمیں بھی گرما دے
لحد بھی اُس کی اندھیروں سے پاک فرما دے

سحر انصاری

جوہر درد آشنا

ثابت ہوا یہ جوہرِ درد آشنا کے بعد
بڑھتی ہے قدرِ مہر و وفا، ہر سزا کے بعد

طوقِ گلو کے بعد، نہ زنجیرِ پا کے بعد
وہ سر نگوں ہوا نہ کسی ابتلا کے بعد

وارفتگانِ ظلم کو شاید خبر نہ تھی
اک انتہا بھی ہوتی ہے ہر ابتدا کے بعد

ہوتے ہیں یوں بھی قید سے آزاد دیکھنا
دامِ فرنگ ٹوٹ گیا ہے قضا کے بعد

اے منکرینِ معجزۂ خاک، دیکھنا
کیسی بہار آئی ہے، رقصِ صبا کے بعد

سورج کی اک کرن سے چھٹی شب کی تیرگی
مشکل ہے بے وفائی کسی باوفا کے بعد

گونگی فضا میں مرکزِ گویائی بن گئے
کتنے چراغ، اس کے چراغِ صدا کے بعد

جوہر کے ایک شعر نے لکھوائے ہیں یہ شعر
پڑھتا ہوں جس کو اب میں سحر ہر دعا کے بعد

"قتلِ حسین، اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

شاہدہ تبسم

جوہر

جوہر ایک مکمل دنیا، جوہر ایک نئی تاریخ
اس کے تابع فرمان دیکھے ہم نے زحل ہو یا مریخ

عزم و عمل کا زندہ پیکر، جذب و جنوں کا صورت گر
اس کا قلم شمشیر سے بڑھ کر اسکی زباں صد لعل و گہر

ظلم و ستم کی ظلمت میں وہ مہر منور بن کے اٹھا
سوئی ہوئی اک قوم میں وہ بیدار مقدر بن کے اٹھا

اس کے دم سے چرچا تھا، اور ہر سو تھا آزادی کا
سر چڑھ کر جو بولتا ہے وہ جادو تھا آزادی کا

جوہر کے ایمان و یقیں کا دائم احساں ہم پر ہے
اس کی کلمہ کا چاند ستارہ اب اپنے پرچم پر ہے

ابواللیث صدیقی

میر محفوظ علی

(اس تحریر کے لئے بیشتر مواد سید محفوظ علی صاحب کے پوتے سید مسعود علی نقوی سلمہٗ نے میر صاحب کے اصل مسودات و آثار مجھے دے کر فراہم کیا جس کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔ ان مسودات میں اس عہد کے کم و بیش تمام اکابر سے میر صاحب کی خط و کتابت کا ذخیرہ موجود ہے جو اس لائق ہے کہ مرتب کر کے شائع کیا جائے۔)

مولانا محمد علی جوہر، رئیس الاحرار، جنگ آزادی کے شیر دل مجاہد، آتش نوا خطیب، مقرر، صفِ اول کے قائد، صحافت میں آپ اپنا جواب، جن کی انگریزی کی داد خود اہلِ زبان نے دی اور جن پر آج بھی کامریڈ کے فائل اور اُن کی دوسری تحریریں گواہ ہیں، معلم اور اس پایہ کے کہ ایک نئے تعلیمی تجربہ کو جنم دے کر اس قابل کر دیا کہ آج اس کے برگ و ثمر ہمارے آپ کے سامنے ہیں، یہ جنہوں نے قید و بند کی آزمائش کو یوں ہنس کر قبول کیا۔

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

وہ محمد علی جن کے بارے میں ایچ جی ویلز نے کہا تھا کہ محمد علی جوہر کا دل پنولین کا، قلم میکالے کا اور زبان برک کی تھی، آج انہیں محمد علی جوہر کی یاد میں ان کے ایک عزیز، ایک رفیقِ کار، ایک شریکِ راز، ایک استاد، ایک دوست،

اور غم خوار کا تذکرہ موضوعِ گفتگو ہے، جو ناموروں سے زیادہ ناموری کے مستحق تھے لیکن جنہوں نے گمنامی اور اخفا کو اپنے لئے ایسا پسند کیا کہ اندازِ قدسے بھی پہچاننے والے شاید گنے چنے ہی ہوں گے۔ یہ سید محفوظ علی بدایونی تھے جو عرفِ عام میں صرف میر صاحب مشہور تھے۔ استاذ الاساتذہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کے باب میں لکھا ہے:

"ان کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انہوں نے اس زمانے میں شہرت نہ چاہی جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی تھی لیکن وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے اور اب جب شہرت ماری ماری پھرتی ہے تو وہ تقریباً گمنام ہو گئے تھے۔"

اس گمنام نابغۂ روزگار کے بارے میں یہ قول بھی رشید صاحب کا ہی ہے۔

"ہر بڑی شخصیت اور ہر بڑے کارنامے کے پیچھے عام نظروں سے اوجھل بظاہر ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات لیکن دراصل پختہ کار ہستی ہوتی ہے اور اس کو تقویت بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ یہ ہستی جدال و قتال کے میدان اور عیش و طرب کی محفل دونوں سے الگ رہتی ہے لیکن میدان و عمل دونوں میں اسکا عمل و دخل پوشیدہ رہتا ہے۔ ایک مدت تک مولانا محمد علی پر سید محفوظ علی کا اسی قسم کا اثر و تسلط رہا۔ سید صاحب کے درجے کو متعین کرنے کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مولانا محمد علی سید محفوظ علی سے بے جھجک ہونے کی ہمت نہ کر سکے۔ جو لوگ مولانا محمد علی کی بت شکنی اور خود شکنی سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید کا وہ کون سا سکوت ساحل تھا جو سمندر کی سطوت سے باخبر تھا اور بے پروا بھی۔"

اس کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ بیان بھی سنئے:۔

"سید محفوظ علی اپنے دور کے بڑے اچھے لکھنے والے اور شوخ نگاری اور ظرافت کے ایک طرزِ خاص کے موجد تھے۔ ظرافت ذرا اونچے اور اعلیٰ قسم کی

تھی۔ عوام کی سطح سے بلند، قلم اور طینت دونوں کا جوہرِ خاص شرافت تھی۔ ہر ایک کے ہمدرد و غمخوار، بڑے صلح جو، ذاتی زندگی میں سخت متشرع اور پختہ دیندار، بچپن میں محمد علی کے استاد شفیق رہے اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے رفیق، علی برادران کے حلقے کی ایک ممتاز شخصیت اور ان کے دور کی ایک یادگار۔"

میر صاحب نے مولانا محمد علی کی یاد میں جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی حصے سے اس رفاقت کا اندازہ لگائیے۔

"محمد علی کا اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت اپنے ان حقیقی بھائیوں اور امتیاز اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آئے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔ دو برس بعد وہ شوکت کی معیت میں علی گڑھ چلے گئے جہاں ۱۸۹۳ء میں میں بھی پہنچا، اور پھر ساتھ ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں میں فارغ ہو کر علی گڑھ سے چلا آیا اور دو تین سال بعد انہوں نے بی۔ اے کیا، ولایت گئے اور واپس آئے۔ ۱۹۰۶ء میں جب وہ بڑودہ میں تھے، ہم دونوں پھر ملے اور عرصہ تک بمبئی میں ہر پندرھویں بیسویں دو ایک دن ایک ہی جگہ قیام ہوتا رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۲ء سے یعنی جب سے کامریڈ دہلی آیا نظر بندی کے وقت تک برابر چوبیس گھنٹے یکجائی رہی لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی کی کتاب زندگی اول کے دس اور بیچ کے دس گیارہ ورق چھوڑ کر پوری میرے پیشِ نظر ہے بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے لکھے گئے ہیں۔

"محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذباتِ عالیہ سے بیگانہ نظر آتے تھے جنہوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اپنی حدود

کی پہنائی اور لہریں ساحل کی آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا۔ شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں پرورش پا رہا تھا۔ جب وہ ولایت کو روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقلِ مآل اندیش کا قبضہ مگر ان کے دل پر عشق مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و منافقت کارفرما تھی۔ عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم۔ علی، آئی، سی، ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں، عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھلائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لئے ججی کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور حج کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرۂ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ ادریسؓ اور بلالؓ کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرضکہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ تھا کہ شہید ہوں۔ اس کشاکش میں پایان کار عشق ہی کامیاب ہوا یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے۔ یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس مکتب کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھئے۔ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔"

میں اس اقتباس کو طول نہیں دوں گا۔ "محمد علی کی یاد میں" اس عنوان سے یہ طنزیات و مقالات سید محفوظ علی بدایونی میں شامل ہے۔ اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ دونوں کے اس قلبی تعلق کی دستاویز ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اسی سلسلے کے دو مضمون اور ہیں۔ "بلبلانِ اسیر کی رہائی" اور "محمد علی"۔ بلبلانِ اسیر کی رہائی ایک بچہ اور اس کے چچا کے مکالمے سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں اس استقبالی جلوس کے دیکھنے کو نکلے ہیں جو علی برادران کے قیدِ فرنگ سے وقتی آزادی کے موقع پر نکلا تھا۔ وقتی آزادی میں نے یوں کہا کہ اس کے بعد بھی مولانا کو بارہا اس میدان سے گزرنا

پڑا جسے انہوں نے خود اپنے لئے پسند کیا تھا۔ برسبیل تذکرہ یہ کہتا چلوں کہ اسی حلقۂ رندا میں مولانا ظفر علی خاں بھی تھے اور انہوں نے بھی اپنی زندگی کا طویل عرصہ اسی سرکاری مہمان خانے میں گزرا تھا اور اسی جرم میں کہ وہ ملک اور قوم کی آزادی کے طلبگار تھے۔ آگے مکالمہ میں ایک ضعیفہ (حجن) خاتون کی گفتگو ہے جو شوکت علی اور محمد علی کے کارناموں کو ایک ایک کر کے گناتی ہیں۔ بات یہ تھی کہ بی اماں اور ان کے نامور بیٹوں نے اس لگن کو گھر گھر پہنچا دیا تھا اور ہزار پردوں میں رہنے والیاں بھی جن کو سیاست کی ابجد سے بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کے ناموں اور کاموں سے آشنا ہو چکی تھیں۔ بغرضکہ مکالمے مختلف طبقات، مختلف ذہنی صلاحیتوں، مختلف مصلحتوں اور اندیشوں کے شکار، قدامت پرستوں اور روشن خیالوں، مذہب سے بیگانوں اور دینداروں کی گفتگو ہے محمد علی کے مسلک اور ان کی جد وجہد کا بیان ہیں۔ میں صرف ایک مختصر ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں۔ مولانا محمد علی کے متعلق بعض حضرات کو شکوہ تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں میر صاحب کی اصطلاح میں "قلم گستہ مہار" ہو جاتے ہیں۔ میر صاحب ایک ایسے شخص کی زبان سے جسے بہت سے لوگ "تاریک خیال" کے نام سے پکارتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"اگر گستہ مہاری سے آپ کی مراد اعلان حق اور اعلائے صدق ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے دلی آنے سے بہت پہلے بجائے قلم کی زبان پر قطار کھنے کے اس کی ناک پر قطار کھ دیا تھا تاکہ مہار ڈالنے کی جگہ ہی نہ رہے۔ بندہ پرور جس حالت کو آپ گستہ مہاری کہتے ہیں اسی مقام کو حضرت آشفتہ سراں تفتہ جگر "زیدہ اللہ جنونہم" اپنی اصطلاح میں دعوت سنگباری سے موسوم فرماتے ہیں۔ اسی نشہ دعوت ہی کا اہتمام تو تھا جو محمد علی قطب مینار پر چڑھ چڑھ کر پکارتے تھے ؎

طفلان شہر بے خبر اند از جنون ما

یا این جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

یہ بات مولانا محمد علی جوہر کے کردار کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن اُن کے پورے کردار کو سامنے رکھیں اور میر محفوظ علی کی زندگی کے اُن واقعات کو جو اُن کی پردہ پوش شخصیت کی صرف چند جھلکیاں ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں صرف ہمکلامی، ہم زبانی اور ہم خیالی ہی نہیں تھی بہت حد تک ایک، دوسرے کی شخصیت کا عکس اور آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے دونوں کے خاندانی ماحول کو دیکھئے۔ دونوں کے گھرانوں کا ماحول مذہبی تھا اور اُن کے گھرانوں میں وہی تہذیب اخلاق اور کردار نظر آتا تھا جو اس عہد کے شرفا کا طرۂ امتیاز تھا۔ دونوں خاندانوں میں خالص مشرقی روایات کے باوجود مغربی تعلیم کے اثرات آہستہ آہستہ نفوذ کر رہے تھے، جب ہی تو ایک طرف محفوظ علی بدایوں سے اور دوسری طرف علی برادران رامپور سے ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے بریلی کے سرکاری اسکول بھیجے جاتے ہیں جہاں ان دونوں کی پہلی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب بقول میر صاحب اُن کی عمر صرف دس سال تھی۔ میر صاحب کی ولادت ۸ مئی ۱۸۶۰ء کو ہوئی۔ اس حساب سے جب ۱۸۸۸ء میں اُن کی محمد علی سے پہلی ملاقات ہوئی تو میر صاحب اٹھارہ سالہ جوان اور محمد علی دس سالہ صاحبزادے تھے۔ ظاہر ہے اثر و نفوذ میں میر صاحب کا ہی پلہ بھاری رہا ہوگا اور اسی بناء پر مولانا عبدالماجد، میر صاحب کو محمد علی کا "نیم استاذ" بناتے ہیں۔ مولانا شوکت علی اور محمد علی دونوں علی گڑھ چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۹۰ء کا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں میر صاحب بھی علی گڑھ جا پہنچے، باوجود سرسید سے مختلف معاملات میں اکثر لوگوں کے اختلاف کے علی گڑھ کو تعلیم جدید یا مغربی تعلیم کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بدایوں سرسید کی مخالفت کا ایک بڑا گڑھ تھا اور اسی شہر میں وہ مولوی علی بخش بھی تھے جو سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لینے کی غرض سے حج کے لئے تشریف لے گئے اور عالمِ اسلام کے علماء سے اس تکفیر کی تائید کراتے پھرے۔ میر صاحب اسی شہر کے باسی تھے۔ اُن سے پہلے خاندان میں کسی نے انگریزی نہیں پڑھی تھی لیکن میر صاحب کو انگریزی پڑھنے اور جدید تعلیم

حاصل کرنے علی گڑھ ہی بھیجا گیا۔ اس زمانے کے علی گڑھ کے ان نوجوانوں کے نام اب تک کانوں میں گونجتے ہیں۔ شوکت علی، محمد علی اور محفوظ علی کے ساتھ مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، سید سجاد حیدر یلدرم۔ یہ سب اس وقت اس علیگڑھ میں جمع تھے جسے سرکار پرستوں کا مرکز اور نیچریوں کا مستقر سمجھا جاتا تھا لیکن اسی علی گڑھ نے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، میر محفوظ علی کے علاوہ کتنے لوگ پیدا کئے جن کا وجود ان تہمتوں کی تردید کرتا ہے۔ ایک نام رئیس الاحرار مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا ہی ہے۔ میر صاحب کے سلسلے میں صرف دو واقعات سنئے۔ ایک اُن کی داڑھی رکھنے سے متعلق ہے جسے علامہ سید سلیمان ندوی نے یوں بیان کیا ہے۔

"ایک دفعہ گرمیوں میں وہ علی گڑھ سے کہیں جارہے تھے۔ پیاس شدت کی تھی۔ گاڑی میں سوار ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ نہایت ثقہ صورت اس میں بیٹھے ہیں۔ سامنے نہایت نازک اور سبک صراحی جس پر سرخ یکر نگہ ٹول کا کپڑا منڈھا تھا اور آبخورہ بھی تھا۔ یہ داڑھی صاف علی گڑھ کے نوجوان تھے۔ پیاس کی طلب نے یہ صراحی دیکھ کر بے تاب کردیا۔ صاحب صراحی سے پانی پینے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ آپ مسلمان بھی ہیں۔ میر صاحب نے کلمہ پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ کلمہ تو ہندو بھی پڑھ دیتا ہے۔ یہ ظریفانہ شوخی کے ساتھ بولے تو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کردوں۔ وہ بزرگ بھی بے دھڑک نکلے۔ یہ ثبوت تو یہودی بھی پیش کرسکتا ہے۔ اب میر صاحب کا ترکش خالی ہوگیا، ہار مان لی۔ شرم سے پسینہ آگیا۔ آخر ان بزرگ نے پانی دیا اور انہوں نے پیا۔ اس ساقی کے ایک جام نے ان کے خیالات کی دنیا بدل دی"۔

مولانا محمد علی کی زندگی میں بھی ایک ایسا موڑ آیا جس میں مسٹر محمد علی مولانا محمد علی بن گئے۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر میگزین کا ایک خصوصی شمارہ نکلا

تھا۔ اس میں ایک ہی صفحہ پر ایک طرف مسٹر محمد علی اور دوسری طرف مولانا محمد علی ہیں۔ میر صاحب کی عبادت کا یہ پہلو بھی اُن کی زندگی کے اور پہلوؤں کی طرح پردہ میں ہی رہا اور کیا خبر مولانا محمد علی کے پردہ میں کون تھا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا بیان ہے کہ کوکناڈا میں کانگریس کا اجلاس تھا۔ مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ اپنے خطبے کا اردو ترجمہ کرانے کے لئے مولانا کو بلایا اور لکھا کہ میر محفوظ علی پہلے آچکے ہیں، فوراً پہنچو۔ اب مولانا عبدالماجد سے سنئے۔

"میر محفوظ علی صاحب کے لئے ایک وسیع خیمہ الگ نصب تھا۔ اس میں جگہ ملی۔ یہ مُلّائے بدایونی بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ دیکھنے میں ٹھیٹھ دنیادار علی گڑھ کے گریجویٹ، اِدھر پچھلی رات ہوئی کہ آپ چوروں کی طرح اُٹھے، دبے پاؤں چلے اور وسطِ دسمبر کی شدید سردی میں باہر جاکر وضو کرآئے۔ تہجد پڑھ رہے ہیں۔ اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ۔ چوری پھر بھی کھل ہی گئی۔ میری نیند کھٹکے کی ہے۔ آنکھ کھل جاتی اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس جوان ہمت سفید ریش کے اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا۔"

میر محفوظ علی یا مولانا محمد علی کی یہ مذہبیت، نہ ملّائیت تھی، نہ مذہبی جنون کا نتیجہ، نہ اپنی لیڈری چمکانے کا ایک بہانہ ایک تو دونوں مسلمان گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں دینداری کا چرچا تھا۔ دوسرے جدید تعلیم سے جہاں بعض اور شکوک و شبہات اور خدشات پیدا ہوئے تھے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ اس تعلیم کے نتیجہ میں یا اس کے زیرِ اثر جو نوجوانوں کی نئی نسل انگریزی مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر نکل رہی تھی، وہ مذہب سے نہ صرف بیگانہ ہوتی جارہی تھی، بلکہ اُسے ترقی میں حائل سمجھنے لگی تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کی قید نہ تھی۔ ماسٹر رامچندر داس اونچی ذات کے ہندوؤں میں غالباً پہلے شخص تھے جو اس صف میں آتے تھے اور جن کے عیسائی ہوجانے پر دہلی میں اس نئی تعلیم کو عیسائی بنانے کا ایک ذریعہ

سمجھا جانے لگا تھا، ڈپٹی نذیر احمد نے جو خود بھی دلّی کالج میں پڑھ چکے تھے، ابن الوقت کے عنوان سے جو ناول لکھا، اس میں بھی ایک ایسے ہی نوجوان کا ذکر ہے جو اس سیلاب میں بہہ گیا اور جس پر یہ مثل واقعی صادق آتی ہے کہ دھوبی کا کتا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اور یہ محض مسلمانوں یا ہندوؤں کا وہم یا خام خیالی نہ تھی اسی کا ردِ عمل تھا کہ سرسید کو بھی جدید مغربی تعلیم اور انگریزی کی اہمیت کے باوجود اپنی تعلیمی تحریک میں مذہبی تعلیم کو بھی شامل کرنا ہی پڑا۔ مگر چونکہ سارا زور تو مغربی تعلیم، جدید تعلیم، جدید علوم و فنون، جدید سائنس، مادی ترقی، اعلیٰ سرکاری ملازمتوں اور ہندوستان میں تعلیم کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے سانچوں میں ڈھالنے پر تھا اسلئے مذہبی تعلیم بس نام کے لئے تھی۔ اسی ردِ عمل نے دیوبند، ندوہ اور اسی طرح کے دوسرے اداروں کی ضرورت پیدا کی۔ بے شک سرسید ایک عالم تھے اور اگرچہ ان کے بعض مذہبی خیالات سے خود ان کے مداحوں اور رفیقوں کو بھی اختلاف تھا اور ہمیں ان کے خلوصِ نیت میں بھی کوئی شبہہ نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ انکی تحریک سے مسلمان نوجوانوں میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہوا جس نے مذہبی تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، تاہم جسے عام طور پر مذہبی راسخ الاعتقادی کہا جاتا ہے، اس کو اس جدید تعلیم کے مجوزہ انداز اور اس پر عمل نے تقویت پہنچانے کی بجائے ضعیف ہی کیا اور آگے چل کر اس کے ردِ عمل کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے نتیجہ میں مختلف تعلیمی تجربے کیے گئے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اب میں دونوں کی سیرت کے ایک اور مشترک پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ قصہ ملازمت کا ہے۔ میر صاحب نے اپنی ملازمت کا آغاز ۱۸۹۲ء میں جسٹس سید محمود کی سفارش پر ریاست خیرپور (سندھ) میں اسسٹنٹ جج کی حیثیت سے کیا۔ اور اپنی محنت، لیاقت، فرض شناسی، دیانتداری اور تفقاہت کی بدولت نائب وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ہمارے یہاں خاص کر اُس دور میں ریاستوں

کا عجب حال تھا اور درباداری کے لئے ان چیزوں کی بالکل ضرورت نہ تھی، جو میر صاحب کے نزدیک شرافت اور کردار کی اساس تھیں چنانچہ بہت جلد میر صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔

پھر قسمت انہیں ایک اور ریاست میں لے گئی۔ یہ ریاست حیدرآباد تھی۔ یہاں کے بہت سے لطائف میر صاحب بیان کرتے تھے، جن میں ایک لطیفہ یہ تھا۔ کہ سال بھر سے زیادہ نوکری کرتے رہے لیکن تنخواہ نہیں ملی اور گھر سے خرچ منگواتے اور خرچ کرتے رہے۔ سبب یہ تھا کہ وہ مُلکی نہیں تھے اور ملکی ہونے کا سرٹیفکیٹ اس کے لئے ضروری تھا۔ اگرچہ میر صاحب کے بعض قدردان اس جعلی سرٹیفکیٹ کا انتظام کرنے کے لئے آمادہ تھے لیکن میر صاحب نے قبول نہیں کیا تاآنکہ کسی اوپر کی منزل سے یعنی صاحب ریذیڈنٹ بہادر کے اشارۂ ابرو پر یہ شرط معاف ہوئی۔ اس عرصہ میں ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل سرتھیوڈور ماریسن کی تجویز پر انہیں جج بربرہ سومالی لینڈ افریقہ مقرر کیا گیا۔ میں نے میر صاحب کے ذاتی کاغذات میں جو اُن کے پوتے سید مسعود علی نقوی سلمہٗ نے ازراہِ کرم مجھے استفادہ کے لئے دیئے ان کا تقرر نامہ دیکھا ہے لیکن یہ ملازمت بھی سازگار نہ آئی۔ اسباب کیا ہوئے، ان کا پورا پورا حال تو معلوم نہیں لیکن دو باتیں سامنے آئی ہیں، ایک تو یہ کہ مولانا ظفر علی خاں جو میر صاحب کے علیگڑھ کے ساتھیوں اور حلقۂ یاراں میں تھے، ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے۔ اُن کے ساتھ کیا کیا گزری، اس کا تو پتہ نہیں اتنا معلوم ہے کہ کوئی مسٹر واکر ریاست میں ریونیو سکریٹری تھے۔ مولانا نے اُن کی ہجو میں "واکر نامہ" لکھا۔ ایک تو ریاست اور پھر اس کے ولایتی ریونیو سکریٹری کی ہجو ایسا گناہ تھا کہ مولانا کو حیدرآباد سے شہر بدر کر دیا گیا اور وہ سیدھے سومالی لینڈ میر صاحب کی خدمت میں پہنچے اور تقریباً ایک سال وہیں مقیم رہے۔ میر صاحب اور ظفر علی خاں نے کیا کیا منصوبے بنائے لیکن اتنا معلوم ہے کہ میر صاحب اس ملازمت کو بھی ترک کر کے

وطن واپس آگئے اور طے ہوا کہ اب ملازمت کا سلسلہ ختم۔ ایک نیا تجربہ کیا جائے۔ یہ تجارت کا تجربہ تھا۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں اور میر صاحب نے بمبئی کو اس کام کے لئے منتخب کیا کیونکہ اس شہر کی تجارتی رونق اور بمبئی کے سیٹھوں کی پھلتی پھولتی تجارت نے عجب سبز باغ دکھائے تھے۔ شاید یہ بھی خیال ہو گا کہ نوکری پھر نوکری ہے، وہ کسی ریاست کی ہو، انگریز کی ہو یا کسی اور ملک اور سرکار کی اور پھر اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ چنانچہ بڑے زور سے کاروبار شروع ہوا اور نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی سے ملاقاتوں کا سلسلہ بمبئی میں جاری رہا۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۰ء کے ایک مکتوب میں جو مولانا محمد علی نے میر صاحب کے نام لکھا ہے۔ اپنی ملازمت سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس کے اسباب بھی کچھ ایسے ہی تھے جیسے مولانا ظفر علی خاں اور میر صاحب کے حال میں بیان ہوئے۔ میر صاحب نوساری پہنچے اور مولانا محمد علی کے ساتھ قیام کیا۔ کامریڈ اور ہمدرد جاری کرنے کا منصوبہ بھی اسی زمانے میں بنا، گویا اس معاملہ میں بھی میر صاحب کا پرتو محمد علی کی شخصیت میں جھلکتا ہے۔ وہی ملازمت سے بیزاری، وہی طبیعت میں آزادی کی اُمنگ، وہی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر۔ یہاں سے محمد علی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ سودا جو سر میں سمایا اس کے اظہار کا وقت آچکا تھا اور میر صاحب کی شخصیت کا جادو پوری طرح اثر کر چکا تھا۔ یہ بھونچال پہلی جنگ عالمگیر کے ساتھ آیا۔ خاص طور پر اسلامی دنیا اور بالخصوص ترکوں پر جو مظالم ہوئے، اُن کی پوری تاریخ تو ابھی لکھی جانی ہے لیکن مولانا محمد علی اور شوکت علی نے تحریک خلافت شروع کی اور میر صاحب نے بھی اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ مجلسی آدمی نہیں تھے اور جلسے جلوسوں سے تو بہت گھبراتے تھے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میر صاحب اس تحریک سے الگ رہیں چنانچہ اس سلسلے میں علی برادران کے علاوہ اور اکابر بھی بدایوں آئے اور ان سب کا قیام میر صاحب کے ساتھ رہا۔ اس طرح میر صاحب کا

عزلت کدہ اس تحریک کا مرکز بن گیا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی اس تحریک کے ایک اور شعلہ بیان قائد تھے۔ میر صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں بکثرت خطوط مولانا کے موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اہم معاملہ میں میر صاحب سے ضرور مشورہ کرتے اور اس طرح علی برادران اور تحریک خلافت کے قائدین کے پسِ پردہ ایک گمنام گوشہ نشین کا دماغ اور جذبہ کارفرما تھا۔

جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ کا اجرا ہوا۔ اسکی حکمتِ عملی بنیادی طور پر برطانوی حکمرانوں کے خلاف تھی اور مسلمانوں پر خاص طور سے جو مظالم ڈھائے گئے تھے، ان پر احتجاج تھا۔ چنانچہ آزادیٔ وطن کی ہر تحریک کے ہر مرحلے پر مولانا محمد علی جوہر نے اپنے زورِ قلم سے جو معجزے دکھائے ان میں بھی اُن کے رفقا مولانا ظفر علی خاں اور سید محفوظ علی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ وہی جراتِ گفتار، وہی بے باکی، وہی شعلہ بیانی۔ ۱۹۱۲ء میں جب کامریڈ دہلی سے نکالنے کا فیصلہ ہوا تو ۱۹۱۳ء میں روزنامہ ہمدرد بھی نکالا گیا۔ مقصد دونوں کا ایک تھا اور ہمدرد میں خاص طور پر میر محفوظ علی کو لکھنے کی دعوت دی گئی۔ میرے سامنے مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور دیگر اکابر کے جو تار اور خطوط ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدرد کا دارومدار خاص طور پر میر صاحب پر تھا۔ مولانا شوکت علی ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"برادرم السلام علیکم !

جب سے تم دہلی سے گئے ہو، کوئی خط تک اپنی خیریت کا نہیں بھیجا۔ محمد علی سے وعدہ کر گئے تھے کہ ایک مضمون تجاہلِ عارفانہ کا لکھوں گا اور اس کے واسطے صادق (؟) نے ایک کتاب لائبریری سے نکال کر دی تھی۔ اب لکھو کہ کب وعدہ وفا کرو گے۔

ایک نہایت زوردار مضمون، کچھ واقعاتِ جنگ پر تنقید۔ ہندوؤں مسلمانوں کی سوشل حالت کے متعلق بھی ضرور ہوگا۔ فاروقی صاحب چلے گئے ہیں اب

"تجاہلِ عارفانہ" کا سہرا آپ ہی کے سر رہیگا۔
مولانا محمد علی کا ایک تار ہے۔

PLEASE COME HERE IMMEDIATELY.
IF NOT SURE WRITE AT LEAST
WITOUT FAIL.

MOHAMMAD ALI.

ایک اور دیکھئے:-

YOU WILL BE TOO LATE FOR MY
WORK. IF POSSIBLE COME IMM-
-EDIATELY.

اور میر صاحب کا جواب ہے:-

INDISPOSED, COMING THE MOMENT
I FEEL BETTER.

ایک اور تار دیکھئے۔ اس کی تاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۴ء ہے۔
اور میر صاحب کا "تجاہلِ عارفانہ" لوگ جس طرح پڑھتے تھے اس کا
ایک اندازہ ڈاکٹر انصاری کے اس خط سے کیجئے۔

۳ر نومبر ۱۹۱۲ء

برادرم معظم و محترم، السلام علیکم
سرفراز نامہ باعثِ افتخار ہوا۔ بعد از انتظار محمد ہاشم صاحب تشریف
لائے، میں نے بغور دیکھا اور مشورہ و صلاح دیدی اور جو کچھ میری رائے
ناقص میں آیا ان کو سمجھا دیا۔ محمد ہاشم صاحب سے ملنے کا موقع بہت کم
ہوا۔ مجھ کو اس کا یقین ہے کہ وہ ایک نہایت ہی شریف النفس اور نیک
خیال آدمی ہیں۔

اس ہفتہ کا تجاہل عامیانہ کچھ یوں ہی سا تھا۔ آپ کی توجہ اس جانب دلاتا ہوں۔ امیر علی اور سید وزیر حسن صاحب کے خط و کتابت کا ذکر پانیر میں اور نیز محمد علی کے تار سے معلوم ہو گا۔ آپ کا خیال اس بارے میں کیا ہے۔

یہ فرمائیے، اب آپ کا دیدار کب تک نصیب ہو گا۔

فقط

نیاز مند

مختار احمد انصاری

اب میں مولانا محمد علی کی زندگی کے ایک اور اہم پہلو اور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس میں میر محفوظ علی کا بھی ہاتھ ہے۔ تحریکِ خلافت نے پہلی مرتبہ برصغیر کے مسلمانوں میں ایک عوامی تحریک کی حیثیت سے قبولِ عام حاصل کیا۔ اسی عرصہ میں گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک شروع کی اور جیسا کہ آپ سب حضرات کے علم میں ہے، تحریک خلافت میں جس قدر اکابر شامل تھے وہ سب ترک موالات کی تحریک میں شامل ہو گئے اور بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں یہ تحریک اب دستوری احتجاج کے دائرے سے باہر نکل کر انقلاب کی وسیع فضا میں پھیل گئی اور لوگوں کے دلوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ چنانچہ یہ تحریک اسکولوں اور کالجوں تک پھیل گئی اور طالب علم اپنی درسگاہیں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا ہے اور اس کے قائد علی گڑھ میں مولانا محمد علی تھے۔ محمد علی اور ان کے ساتھیوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ طالب علم اپنے اصل فریضہ یعنی حصول علم کو یکسر ترک کر کے عملی سیاست کے میدان میں کود پڑیں۔ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا اور نوجوان طالب علموں کی ایک ایسی جماعت تیار ہونے کے لئے وقت درکار تھا جن کا سیاسی شعور پختہ ہو گا اور وہ اس تحریک میں عملی طور پر کوئی منصبانہ اضافہ کر سکیں۔ بہر حال اسی علی گڑھ کی کوکھ سے

جہاں سے برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری کی ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ ایک نئے تعلیمی تجربہ نے جنم لیا اور یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ اور اس کے کارنامے آپ سب حضرات کے علم میں ہیں۔ میں اُن کی تکرار نہیں کرتا۔ صرف دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کرنے والوں کا مقصد بنیادی طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ یہ بات علی گڑھ کو بھی حاصل تھی لیکن دوسری اور اصل بات یہ تھی کہ یہ تعلیم اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد ہو۔ جامعہ کے مقاصد کے سلسلے میں مولانا محمود الحسنؒ کے الفاظ خطبہ تاسیس میں یہ تھے۔

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔"

چنانچہ جامعہ ملیہ کی ابتداء دینی پہلو کی اہمیت اور غیر ملکی اثرات سے آزادی کے بنیادی اصولوں پر تھی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی نے مجوزہ جامعہ کے لئے ایک نصاب مرتب کیا جو

A SCHEME OF STUDIES FOR NATIONAL MUSLIM EDUCATIONAL INSTITUTIONS IN INDIA.

کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی تیاری میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا، ان میں مولانا عبدالماجد اور میر محفوظ علی بھی شریک تھے۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ کے دہلی منتقل ہونے سے پہلے ۹ ستمبر ۲۴ء کا ایک خط عبدالماجد دریا آبادی

کا میر صاحب کے نام ہے۔

دریاباد، بارہ بنکی

۹ ستمبر ۲۴ء

برادر مکرم، السلام علیکم

مزاج گرامی ! دسمبر ۲۳ء میں زیادہ تر آپ ہی کے خیال سے علی گڑھ حاضر ہو گیا تھا۔ اب آپ کی باری ہے۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔

انشاء اللہ ایک ہفتے میں یعنی ۱۶ ار ۱۷ تک دہلی پہنچنے کا قصد ہے۔ ضرور آپ بھی مشرف فرمائیں۔ اسٹاف کا تقرر، ابتدائی مضامین کا انتخاب وغیرہ متعدد اہم مسائل ہیں جن کے متعلق عرض معروض کرنے کا مجھے حکم ملا ہے لیکن آپ کا مشورہ یقیناً مقدم ہے۔ بغیر آپ کے تنہا میں کچھ نہ کر سکوں گا۔

اس کے جواب میں دو سطریں اپنی تاریخ روانگی کی بابت فوراً تحریر فرما دیجئے۔ اور آئندہ ہفتے میں اپنے دیدار سے دہلی میں مشرف فرمائیے۔ یہ دعوت نامہ تنہا میری طرف سے نہیں، خود مولانا محمد علی کے ایما سے لکھ رہا ہوں۔

عبدالماجد

اسی سلسلے میں مولانا محمد علی کا ایک تار ۵ اپریل ۱۹۲۵ء کا ہے :-

IF POSSIBLE COME IMMEDIATELY FOR SOME WEEKS MOHAMMAD ALI.

اگرچہ مولانا محمد علی کی مجوزہ تجاویز بابت نصاب جن کا اطلاق اُن کے نزدیک برِ صغیر پاک و ہند کے تمام مسلم قومی اداروں پر ہونا چاہیئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں ..... شائع ہوئی تھی لیکن مذکورہ بالا حوالوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مجوزہ نصاب میں علمائے دیوبند کا مشورہ تو شامل ہوگا ہی کیونکہ مولانا محمود الحسن کا انتخاب تاسیسی خطبۂ جامعہ ملیہ کے لئے خود اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، میر محفوظ علی اور دیگر اکابر جو اس مشورہ اور

تجاویز میں شریک تھے وہ بھی سب ایک شدید دینی جذبہ اور قومی حمیت اور غیرت کے زیرِ اثر کام کر رہے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جامعہ ملیہ کے پرنسپل ہوئے اور انہوں نے اس ادارہ میں جس کا قیام اس وقت صرف خیموں میں تھا، اپنے درس اور تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مولانا محمد علی جوہر کے درسوں کا موضوع تھا اسلام اور اسلامی زندگی۔ مولانا کی تربیت ایک دینی عالم کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی۔ علی گڑھ کے طالب علم ویسے بھی کھلنڈرے مشہور تھے اور گردن مروڑی مرغی کھانا، سوٹ پہننا اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اُن کی علامات بتائی جاتی تھیں لیکن محمد علی اور اُن کے ساتھیوں پر دین کی حقیقت کچھ اس طرح کھلی تھی کہ اُن کے محرکات کا ماخذ خود قرآن حکیم اور تعلیمات اسلام بن گئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین فرماتے ہیں۔

"لیکچر دینے والے اور لیکچر سننے والے ایسا تھا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ یہ دنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علی لیکچر کے دوران اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے اشعار کی توضیح کرتے ..... مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا بھر جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ اُن کے دینی جذبہ کا اخلاص غیر مشتبہ تھا، اس لئے اُن کی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی۔ مولانا کی تعلیم و تربیت سے ہر نوجوان میں ایک نیا عزم، نیا ولولہ اور نیا دینی احساس بیدار ہو گیا۔ ان کی اندرونی زندگی میں اخلاقی نشوونما کی ایک خاص لگن پیدا ہو گئی جس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ مولانا کے درسوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ نوجوان قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے جیسے کوئی مدتوں کی بھولی نعمت ہاتھ آ گئی ہو، صبح فجر کی نماز کے بعد پابندی سے قرآن کی تلاوت ہوتی۔ ترجمے اور تفسیریں پڑھی جاتیں"۔

ایک مرتبہ پھر مولانا عبد الماجد دریا بادی کے ایک مکتوب کی طرف توجہ کی ضرورت ہے

خط کی تاریخ ۱۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء ہے اور مکتوب الیہ میر محفوظ علی۔ میں اس خط کی چند سطریں نقل کرتا ہوں :۔

"محمد علی کا مہمان تھا۔ ایک روز صبح اپنے کمرے میں تلاوت با آواز بلند کر رہے تھے۔ میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ جب آیۂ کریمہ یخشون الناس واللہ احق ان یخشاہ پر پہنچے تو بے اختیار ہو گئے۔ بار بار اسی کی تکرار کرتے تھے اور آنسوؤں کا تار تھا کہ برابر قائم تھا۔ آج ایسے قلب کس قدر نایاب ہو گئے ہیں"

یہ بھی میر محفوظ علی اور مولانا محمد علی کی سیرت اور کردار کے مشترک پہلوؤں میں سے ایک ہے میر صاحب کے صاحبزادے سید ابن علی صاحب فرماتے ہیں :۔

"دنیا داری کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے آپ کو جس کام میں لگایا بلکہ وقف کر دیا وہ درس قرآن پاک تھا۔ حج سے واپس ہونے کے بعد ہی انہوں نے ایک بزم قائم کی جس میں فارغ التحصیل اصحاب کے علاوہ اسکول کے اساتذہ، وکلا اور کچھ احباب شریک تھے۔ بعد مغرب یہ لوگ ہماری مردانہ رہائش گاہ پر جمع ہو جاتے اور ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ کلام پاک پڑھا اور دوہرایا جاتا۔"

مجھے ذاتی طور پر ان مجلسوں میں سے بعض میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب میں علی گڑھ میں اپنی تعلیم کے لئے نیا نیا پہنچا تھا اور بدایوں صرف تعطیلات میں آتا تھا۔ ان مجلسوں میں میری شرکت میرے استاد مرحوم سبطین احمد کے ساتھ ہوتی۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے میری تعلیم و تربیت میں ان کی شفقت اور توجہ نے اس خاک میں بھی ایک آدھ چنگاری جگا دی اور میر صاحب کی خدمت میں اسی وسیلہ سے رسائی ہوئی

لسانیات کے ابتدائی مطالعے کا شوق بھی مجھے میر صاحب کی صحبت نے عطا کیا لیکن یہ تو جملۂ معترضہ تھا، اصل گفتگو یہ تھی کہ میر صاحب، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا محمد علی

سب کے دل میں ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ یہ کہ اپنی قوم میں دینی جذبہ پیدا کریں اور اس کے استحکام کی صورت نکالیں۔ میر صاحب مرحوم کے ایک اور یار غار مولوی عبدالحق مرحوم اپنے خاص انداز میں میر صاحب کو لکھتے ہیں۔

"برادرم۔ تم حاجی ہو کر کیا آئے کہ خدا کے سوا سب کو بھول گئے"۔

اور یہ مذاق نہیں، میر محفوظ علی خدا کے سوا سب کو بھول گئے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شاعری میں بھی جابجا اس جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ حمد کے اشعار صرف رسمی نہیں، اس میں ذاتی واقعات اور قلبی واردات صاف جھلکتے ہیں۔

تجھے تسکین جاں پایا، تجھے آرام جاں پایا
نہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یارب ادا تیری
وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو بے نشاں پایا
کوئی نامہرباں ہو کر ہمارا کیا بگاڑے گا
کرم تیرا تو ہے ہم پر تجھے تو مہرباں پایا
ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے
اسی کو سرخرو دیکھا، اسی کو کامراں پایا
عنادل ہیں چمن کے تیرے فصل گل سے بے پروا
محبت کو تری ہم نے بہار بے خزاں پایا
حرم میں تھا اک کو یوں تو تیرے عشق کا دعویٰ
جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشق بتاں پایا
ہماری جاں بھی حاضر ہے اس کے اک اشارے پر
کہ جس کو اک جہاں نے آپ ہی جان جہاں پایا
کسی کو ڈھونڈتا دیکھو، خود اپنے گوشۂ دل میں
تو بس سمجھو کہ اب اس نے سراغ لامکاں پایا

پوری غزل مطبوعہ کلام میں ملتی ہے اس لئے صرف چند اشعار درسن لیجئے

خجل خود خجلتِ تردامنی سے ہو گئے عاصی
تری رحمت کو جب دیکھا تو بحر بیکراں پایا
وہ ساقی جس نے تلچھٹ تک نہ رکھی فکرِ فردا میں
اسے کوثر پہ ہم نے قبلہ گاہِ میکشاں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے
کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا

اور حشر کا کیا ہوا، یہ علامہ اقبال کی زبان سے سنئے:۔

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذب حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاکِ اقدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گزشت

یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ علی گڑھ جس کے باب میں مشہور تھا کہ اس کے مجوزہ نصاب تعلیم میں اسلامیات کی لازمی تدریس کے باوجود عام طور پر علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا، میں مذہب سے شدت سے وابستگی تو درکنار اس کے برعکس ایک قسم کی بے اعتنائی پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں کچھ حقیقت بھی ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میر محفوظ علی، مولانا شوکت علی خاں، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ علیگڑھ کے اُن فرزندوں میں ہیں جو اس عام تاثر کی تردید کرتے ہیں اور مولانا محمد علی جوہر تو ولایت پلٹ تھے، اُن کے ولایت کے قیام کے دوران کا ایک لطیفہ میر محفوظ علی مرحوم نے مجھے خود مولانا محمد علی جوہر کے حوالے سے سنایا تھا۔ فرماتے تھے، جب محمد علی انگلستان گئے اور رواج کے مطابق ایک لینڈ لیڈی کے یہاں جس کو ہماری پرانی اصطلاح میں بھٹیارن کہتے ہیں۔ قیام و طعام کا بند و بست ہوا تو

محمد علی نے یہ واضح کر دیا کہ وہ لحم خنزیر سے بر حیثیت مسلمان ہونے کے پرہیز کرتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھا جائے چنانچہ لینڈ لیڈی نے اسے قبول کر لیا۔ مولانا محمد علی مرحوم بڑی کوشش سے حلال گوشت لائے اور اس کے کباب بنا کر لینڈ لیڈی کو صرف تلنے کے لئے دے دیے۔ تھوڑی دیر کے بعد خود باورچی خانہ میں جو گئے، تو دیکھا کہ ایک فرائنگ پین میں ایک طرف مولانا کے بنائے ہوئے کباب اور اسی میں ایک طرف لحم خنزیر تلا جا رہا ہے۔ مولانا بولے، یہ کیا ؟ لینڈ لیڈی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ مسٹر علی! دیکھئے نا، آپ کے کباب بالکل ایک طرف ہیں، میرا گوشت بالکل اس سے الگ۔ محمد علی کیا جواب دیتے۔ بہرحال آئندہ کے لئے سبق ہو گیا۔

چنانچہ ترکِ موالات کے سلسلے میں جب قومی درسگاہوں کی تاسیس کا مسئلہ پیدا ہوا تو مولانا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کے مدارجِ تعلیم، نظامِ تدریس اور نصاب مجوزہ کے خطوط واضح کرنے کے لئے ایک کتابچہ تیار کیا۔

A SCHEME OF STUDIES FOR NATIONAL MUSLIM EDUCATIONAL INSTITUTIONS IN INDIA.

اس دستاویز کی تاریخ ۹ جون ۱۹۲۱ء ہے۔

اس منصوبہ میں تعلیم کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:۔

"THE GOAL THAT HAS ALWAY BEEN KEPT IN VIEW IS TO TURN OUT FROM THESE EDUCATIONAL INSTITUTIONS NOT ONLY YOUNG MEN OF CULTURE ACCORDING TO MODERN STANDARDS,

BUT TRUE MUSALMANS IMBUED WITH THE SPIRIT OF ISLAM AND POSSESSING ENOUGH KNOWLEDGE OF THEIR RELIGION, TO BE ABLE TO STAND BY THEMSELVES AS SUFFICIENTLY INDEPENDENT UNITS IN THE ARMY OF ISLAMIS MISSION ARIES

آگے چل کر اس عظیم منصوبہ کا دوسرا بنیادی مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

NEXT TO THE RELIGIOUS ASPECT OF EDUCATION, ON WHICH GREATER STRESS HAS NOW BEEN LAID THAN EVER BEFORE IT IS TO BE EMPHASISED THAT THE ABSURD AND SLAVISH IDEA OF IMPARTING INSTRUCTION IN THE ARIOUS BRANCHES OF KNOWLEDGE THROUGH THE REFRACTORY MEDIUM OF A FOREIGN LANGUAGE HAS BEEN WHOLLY DISCARDED. THE STUDY OF ENGLISH HAS BEEN RETAINED AS AN OPTIONAL SUBJECT IN THE SECONDARY STAGE AND IT IS DESIRABLE THAT FOR SOME TIME TO COME A LARGE NUMBER OF SCHOOL STUDENTS SHOULD CONTINUE TO LEARN

THE LANGUAGE FROM THE AGE OF THIRTEEN, BUT IT HAS BEEN ENTIRELY REMOVED FROM THE PRIMARY STAGE, AND IN NO CASE IS IT TO BE THE MEDIUM OF INSTRUCTION, THOUGH IT MAY FOR TIME BE NECESSARY TO RE-TAIN EUROPEAN TERMINOLOGY IN THE CASE OF CERTAIN BRANCHES OF SCIENCE."

مولانا محمد علی کی تعلیمی بصیرت اور اُن کے نظریات جن کی تعبیر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صورت میں موجود ہے جو اپنی پنجاہ سالہ جوبلی منا چکی ہے یہ ایک الگ مستقل موضوع ہے جو نہایت تفصیل کا محتاج ہے۔ آج بھی نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد محمد علی جوہر کی تجاویز اُن کے مجوزہ نصاب تعلیم کے باب میں اُن کے پیشِ نظر مقصد میں سے ہم اپنی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے میں بہت کچھ اخذ بھی کر سکتے ہیں اور اس سے سیکھ بھی سکتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا، ان معاملات میں جن لوگوں سے مشوروں کا ذکر مولانا محمد علی نے اپنے کتابچہ میں کیا ہے۔ اُن کے علاوہ اور پس پردہ عبدالماجد دریا بادی اور میر محفوظ علی کی شخصیتیں ہیں۔

ان مختصر گزارشات سے میرا مقصد مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور اُن کے کردار میں اُن کے حلقۂ یاراں میں سے ایک گمنام درویش کا اس رشتہ سے تعارف کرانا تھا۔ بظاہر دو کردار بہت مختلف نظر آتے ہیں ___ مولانا

محمد علی ایک برقِ مجسّم، ایک شعلہ جوالہ، ایک طوفان اور ان کے مقابلہ میں محفوظ علی ایک پُرسکون وسیع سمندر۔ ایک شہرت اور رسوائی کی معراج پر، دوسرا گوشہ نشین اور گم نام۔ ایک سراپا عمل، دوسرا سراپا فکر، ایک عاقبت اندیشی کو کمزوری سمجھنے والا اور دوسرا اعتدال کو سلامتی کا راستہ سمجھنے والا لیکن اس کے باوجود دونوں انگریزوں کی غلامی کے خلاف مجاہد اور صف آرا۔ دونوں تعلیم جدید کی پیداوار لیکن دونوں تعلیم کو ایک نئے مقصد اور ایک نئے رُخ کو متعین کرنے میں پیش پیش۔ دونوں دیندار، خدا پر بھروسہ رکھنے والے، سیاست، تعلیم، روزمرہ زندگی سب میں دین کی اہمیت کے دونوں علمبردار، دونوں سچے عاشقِ رسولؐ، دونوں سچے محبِ وطن۔

اور دونوں کا یہ تعلق شخصی سطح پر کس نوعیت کا تھا۔ اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال پر دسمبر ۱۹۰۹ء میں مولانا محمد علی کو ایک خط میں میر محفوظ علی فرماتے ہیں۔

"دسمبر ۱۹۰۹ء کے پہلے عشرے تک کی دلچسپیاں اور لطف اور اس کے بعد بدمزگی، بے لطفی، خستگی اور کوفت۔ آج اس سر میں کچھ خیال نہیں، لب پر خوشی نہیں، سودا نہیں اس دل میں کوئی امنگ نہیں۔"

اور مولانا محمد علی کا یہ جواب سنئے:۔

"تو برادرم کیا تمہارے عشق و محبت میں تمہارا چھوٹا بھائی شریک نہ ہوتا اور لطف اور دلفریبی کو دوگنا نہ کرتا۔ اگر تم نے بدمزگی، بے لطفی، خستگی اور کوفت میں شریک کیا ہوتا تو کیا یہ شرکت ان سب کو آدھا نہ کر دیتی۔ دوستی کی ریاضی بھی عجیب ہے۔ خوشی کو دوگنا اور غم کو آدھا کر دیتی ہے۔ شرکت رنج میں غیریت صرف غیر کو ہوتی ہے، اپنوں سے بیگانگی صد حیف ہے۔ بھائی اب تمہارے ایک بیوی نہیں، پانچ بیویاں ہیں اور لطف یہ کہ ایک نہ ایک ہمیشہ جوان رہے گی اُن سے غم غلط کرو، ان کی دیکھ بھال کرو، اپنی بیوی کی شکل و صورت، سیرت و شمائل اُن ننھی جانوں میں پاؤ گے اور اُن کے خیال سے امید ہے کہ قوم کے بچوں کا خیال

بھی دل میں جاگزیں ہوگا۔"

یہ آخری فقرہ دیکھئے۔ تعزیت نامہ میں آخری مقصد قوم کے بچوں کا خیال ہے۔

مولانا محمد علی اور میر صاحب کی یہ رفاقت جو ۱۸۹۸ء میں بریلی کے اسکول سے شروع ہوئی، ۴ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ یہ وہ دن تھا جب نو بجے لندن میں اُن کا انتقال ہوا۔ اور ارضِ مقدس میں اُن کی تدفین ہوئی۔ میر صاحب اس صدمہ کو سہنے کو بدایوں میں موجود تھے۔ انھوں نے جو مضمون محمد علی کی یاد کے عنوان سے لکھا وہ ان کے مجموعہ مضامین میں شامل ہے۔ میر صاحب کے اپنے لکھے اصل مسودہ کو میں نے دیکھا۔ مطبوعہ مضمون میں ایک آدھ جملے کا ردّ و بدل ہے۔ اس کی تاریخ ۱۳ر رمضان سنہ ۱۳۴۹ھ ہے۔ غالباً ملک کے تمام ہی اخباروں اور رسالوں نے نقل کیا ہے۔ پہلے مولانا عبدالماجد کے "سچ" میں شائع ہوا۔ مولانا عبدالماجد کا مختصر خط میر صاحب کے نام ۵ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کا چند سطری ہے۔

مخدوم و مکرم۔ اسلام علیکم و رحمتہ اللہ

مشیت الٰہی پوری ہو کر رہی، دل چاہتا تھا جو کبھی نہ مریں، مر کر رہے۔ کیا آپ کی مہرِ سکوت اب بھی نہ ٹوٹے گی۔

محمد علی اور حمید الدین کیا ان دونوں پر کچھ نہ لکھیں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ عالمِ ارواح میں ان دونوں کی روحیں آپ کے بخلِ قلمی کا شکوہ جاری رکھیں سچ کے اوراق آپ کی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔ والسلام محتاج دعا، عبدالماجد

مضمون شائع ہوا تو مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں:

برادرِ محترم۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔ مزاج گرامی

سیرۃ محمد علیؒ کی نوبت تو دیکھئے کب آئے۔ آپ کا مضمون سچ میں شائع ہوگیا اور بہت پسند کیا گیا۔ دوسرے اخبارات میں برابر نقل ہو رہا ہے اور خطوط بھی داد کے میرے پاس بہ کثرت آچکے ہیں۔"

مطبوعہ مجموعہ مضامین میں نقل کرنے والے اخبارات میں سچ کے علاوہ الامان، دہلی فروری ۱۹۳۱ء الحدل بدایوں، ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء سرگزشت علی گڑھ۔ یکم مارچ ۱۹۳۱ء، ہمت لکھنؤ، ۸ مارچ ۱۹۳۱ء اور علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۳۹ء، میر صاحب کے مسودہ میں لاہور انقلاب ...... فروری ۱۹۳۱ء خلافت بمبئی ۱۶ فروری کے نام بھی ہیں۔

اس مضمون کو میں اپنے مرحوم استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک مختصر اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

"مولانا محمد علی کو سید صاحب سے جو دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر تک قائم رہا۔ کامریڈ اور ہمدرد کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا دوسرا بدایوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولانا محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت و حرارت تھی جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا جس کی وجہ سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس کی تپش و طوفان کے بالآخر وہ خود نذر ہو گئے۔ اس نے سید محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہ کیا۔ سید محفوظ علی نے اس مہر نیم روز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی تھی محفوظ علی اپنے نظامِ شمسی خود تھے۔"

یافت و بازیافت

(۳)

- کان کا گایا
- مسعود احمد دہلوی

(۴)

- مالک رام
- بلقیس شاہین
- غلام مصطفیٰ خاں
- یونس حسنی

پروفیسر کان کاگایا

جاپانی ادب

کوجی کی (KOJIKI) جاپانی زبان میں لکھی گئی سب سے قدیم کتاب ہے۔ قدیم جاپان کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ اندازہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے قریب جزیرہ نما کوریا کی وساطت سے چینی رسم الخط جاپان میں آیا۔ روایات میں چینی رسم الخط میں لکھی گئی سب سے قدیم کتاب کا ذکر پانچویں صدی عیسوی کے حوالے سے ملتا ہے۔ رسم الخط کے رواج کے بعد شاہی فرمان کے ذریعے روایتی داستانوں کے جمع کرنے کا عمل شروع ہوا تھا۔ ساتویں صدی میں شہنشاہ **تیمو** (TENMU) کے دورِ حکومت میں اس کام کا نئے سرے سے آغاز ہوا اور آٹھویں صدی کے شروع یعنی ۷۱۲ء میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس مجموعے کا نام **کوجی کی** ہے۔

کوجی کی تین کتابوں پر مشتمل ہے۔ پہلی کتاب کا موضوع تخلیق کائنات ہے۔ اس کتاب میں پہلے شہنشاہ کے جدِ امجد کے حالات ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان سے دیوتاؤں سمیت کیوشیو میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر اُترا۔

دوسری کتاب پہلے شہنشاہ کی کیوشیو سے یامالو کی طرف مہمات اور قدیم جاپانی مملکت کے قیام کی داستان ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بارھویں شہنشاہ کے بیٹے کی زبردست جنگ آرائیوں کا بیان بھی شامل ہے۔ تیسری کتاب پانچویں اور چھٹی صدی کی تاریخ اور روایات سے متعلق ہے۔

یہاں ایک نمایاں اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ **کوجی کی** میں جنگی مناظر کا زیادہ تفصیلی بیان نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مملکت جاپان کی تشکیل کے سلسلے میں کوئی بڑی جنگ نہیں لڑی گئی بلکہ یہ عمل سیاسی مذاکرات یا سیاسی دباؤ کے

ذریعے ہوا۔ اسی لئے جاپانی اصناف ادب میں ہومر کی **الیڈ** یا فردوسی کے **شاہنامہ** جیسا کوئی عظیم رزمیہ موجود نہیں ہے۔ **کوجی کی** میں صرف رزمیہ کی جھلک ملتی ہے۔ کوجی کی میں پانچویں اور چھٹی صدی کے بعد کے ترانے اور اشعار کے نمونے بھی شامل ہیں۔ ان کی خصوصیات سادگی، آزاد تخیل اور پرزور بیان ہیں، جو قدیم ادب کے مشترک عناصر ہیں۔

کوجی کی کی تالیف کے بعد سنہ ۷۲۰ء میں چینی اسلوب کے مطابق **نی ہون شوکی** تالیف ہوئی۔ یہ اصل میں تاریخ کی کتاب ہے اور اس میں دیوتاؤں کے عہد سے لے کر ساتویں صدی تک کے واقعات اور روایات کا ذکر ہے۔

ان دونوں کتابوں کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی مقامی تاریخ کا مجموعہ **فودوکی**، جس میں **ہاری ما** سنہ ۷۱۵ء، **ہی تاچی** سنہ ۷۲۰ء، **ای زومو** سنہ ۷۳۳ء وغیرہ شامل ہیں، شاہی فرمان کے ذریعے مرتب کیا گیا۔ ان کتابوں میں بھی قدیم اشعار کے نمونے ملتے ہیں۔

کوجی کی میں ایک کردار یاماتو ناکے رونوی کوتو آتا ہے۔ وہ یاسیت کا شکار ایک المیہ کردار ہے جو زندگی بھر جد و جہد کے بعد مر کر سارس کی شکل میں آسمان کی طرف اڑ جاتا ہے۔ یہ اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف سفر کی ایک خوبصورت تصویر ہے اور یہ جاپانی شاعری کے رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے۔

جاپانی شاعری کا سب سے قدیم مجموعہ **مان یو شو** (جس کے لفظی معنی دس ہزار پتے ہیں) میں یہی عمل زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں چار ہزار پانچ سو اشعار شامل ہیں، جو سنہ ۳۴۰ء سے سنہ ۷۵۹ء تک لکھے گئے۔ اس میں اونچے اور نچلے طبقے کے دو سو ساٹھ شاعروں کا کلام موجود ہے جن میں شہنشاہ، ملکہ، امراء، سپاہی اور کسان شامل ہیں۔

ان اشعار کی ہیئت اکثر واکا کی ہے جو چینی شاعری کے مقابلے میں ایک جاپانی صنفِ سخن ہے، اور آج تک جاپان میں رائج ہے۔ اس مجموعے کے

پرانے حصے میں اجتماعی رنگ غالب ہے۔ آج تک جاپانی لوگ ان اشعار کے پرزور آہنگ اور بے ساختگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی حصے میں انفرادی عشقیہ شاعری کا بھی بھرپور اظہار ہے۔ اس دور کا شاعر مایوسی اور فراریت میں مبتلا نہیں بلکہ وہ فطرت کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے اور ان کا اظہار بغیر تصنع کے کرتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کا موثر اور شفاف اظہار اس شاعری کو اعلیٰ ادب کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس مجموعے کے آخری شعرا کے کلام میں انفرادی رنگ نمایاں نظر آتے ہیں اور ان میں شاعر اور اجتماعی ماحول کے درمیان بُعد کا احساس ہوتا ہے۔ اسی باعث اس دور میں جذباتی اور انفرادی اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ ان شعرا میں یاکاموچی اعلیٰ عشقیہ شاعری کی وجہ سے بے حد ممتاز ہیں اور ان کے اشعار جدید دور سے قریب تر ہیں۔

ہے آن دور کا ادب (جاپانی ادب کا سنہری دور)

سطور بالا میں ہم نے جس ادب کا تذکرہ کیا وہ تاریخی اعتبار سے قدیم زمانے کے وسط میں آتا ہے۔ جس کے بعد اب ہم دوسرے دور کے ادب کا ذکر کرینگے۔ اس کو ہے آن دور کا ادب کہتے ہیں۔ دراصل قدیم زمانے کے جاپانی ادب پر ہم عصر چینی ثقافت کے گہرے اثرات تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں چین ایشیائی ملکوں میں سب سے زیادہ متمدن ملک تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ گزشتہ دور میں چینی طرز کے ادبی مجموعے یکے بعد دیگرے مرتب ہوئے مگر رفتہ رفتہ ان میں جاپانی رنگ غالب آتا گیا۔

اس دور میں دارالسلطنت کیوتو میں تھا۔ دربار کے امرا بڑی خوش گوار اور پرشکوہ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ موسم بہار کے رنگا رنگ پھولوں سے لطف اٹھاتے اور چاندنی رات کی دعوتوں میں شریک ہوتے اور موسم خزاں میں پتوں

کے بدلتے رنگوں سے محظوظ ہوتے۔ وہ ایسے میں تنکا اور وا[1] کا کہتے اور اپنے محلات میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتے۔ فوجی وارا خاندان خاص طور پر شاہی خاندان کے قریب تھا۔ اس خاندان نے اس دور میں بے حد ترقی کی اور اس کے بہت سے افرادِ درباری امرا میں شامل ہو گئے۔ یہ لوگ ادب اور شاعری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اسی لئے ہے آن دور کے ادب کو مختصر طور پر امرا کا ادب کہا جا سکتا ہے۔

اس دور میں جاپانی حروفِ تہجی "کانا" نے ترقی کی۔ رسم الخط میں یہ تبدیلی نئی ادبی تخلیقات کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اس طرح درباری زندگی کی حقیقی صورت کو نثر میں بیان کرنے کے امکانات پیدا ہوئے اور اسی ذریعے سے بعض اہم فنکاروں نے کہانی کہنے کی راہ نکالی۔ نویں صدی عیسوی تک عورتوں نے بھی کانا میں لکھنا سیکھ لیا۔ اور اس طرح درباری خواتین جاپانی شعر و ادب کی ترقی میں حصّہ لینے لگیں۔ ہے آن دور کی نمایاں خصوصیت عورتوں کا ادب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہے آن دور میں جاپان میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا اور عورتوں کو معاشرے میں اہم مقام حاصل تھا۔ پھر چینی ادب کے مقابلے میں عورتوں کو کانا میں نثر لکھنے میں آسانی محسوس ہوئی۔

دنیائے ادب میں ہے آن دور میں لکھی گئی یادداشتوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ شروع میں مردوں نے چینی رسم الخط میں یادداشتیں لکھیں۔ اس کے بعد خواتین نے کانا میں لکھنا شروع کیا۔ مشہور یادداشتوں میں "کی نو سو را یو کی کی توسانِکّی (۹۳۵ء)" ہے۔ اس کا مصنف کی نو سوُرا یو کی مرد تھا۔ لیکن اس نے عورتوں کی زبان میں یہ یادداشتیں تحریر کیں جس میں کانا اور چینی دونوں رسم الخط استعمال کئے گئے اور اس طرح دونوں کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بے تکلف اور بغیر کسی تصنع کے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ صنف جاپان کی ادبی روایت میں ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ اکثر جاپانی اس صنف کو لکھنا اور پڑھنا آج بھی پسند کرتے ہیں۔

---

[1] چینی شاعری کے مقابلے میں جاپانی اصنافِ سخن

آج کے جاپانی "ناول" کی بنیاد بھی یہی انشائیہ ہے۔ اسی زمانے کی ایک درباری خاتون سے ای شو ناگون کی کتاب ماکوراٴ نو سوشی ۱۰۰۰ء اسی فن کا شاہکار ہے، جس میں اُس نے خوبصورت موسموں اور رنگین جمالیاتی احساسات کی عکاسی کی ہے۔

کانا میں لکھی گئی داستانوں میں تاکے توری مونو گاتاری سب سے قدیم ہے جو اندازاً دسویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔ یہ اپنی ہیروئن "کاگویا ہی مے" کی داستان کے نام سے بہت مشہور ہے۔ یہ بچوں کی کہانیوں کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ جاپان کی سب سے اہم داستان گین جی مونو گاتاری کی مصنفہ موراساکی شی کی ہونے اسے نثری داستانوں کی ماں قرار دیا ہے۔ ایک اور داستان "ای سے مونو گاتاری" ۹۰۵ء بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ نثر میں لکھی گئی اس داستان میں "آری وارا نو ناری ہی را" کی نظمیں جگہ جگہ شامل ہیں۔ یہ اسلوب بیان بھی بعد کے جاپانی ادب کے لئے ایک معیاری نمونہ بن گیا۔ اس داستان کا ہیرو ایک امیر نوجوان ہے جو عشق بازی میں مصروف رہتا ہے اور دربار میں اپنے عہدے سے بیزار معلوم ہوتا ہے۔

گین جی مونو گاتاری نہ صرف "ہے آن دور" کی بلکہ قدیم جاپانی ادب کا ایک نمائندہ شاہکار ہے اور یہ دنیا بھر کے کلاسیکی ادب میں شامل ہے۔ اس کہانی کی مصنفہ "فوجی وارا نو تامے توکی" کی بیٹی تھی۔ اپنے خاوند کی وفات کے بعد وہ اِی چی جو شہنشاہ کی ملکہ کی خدمت پر مامور ہوئی۔ یہ ملکہ فوجی وارا نو می چی ناگا کی بیٹی تھی۔ فوجی وارا خاندان اس زمانے میں اپنی شان و شوکت کے عروج پر تھا۔ اس داستان کا پہلا حصہ ۱۰۰۲ء میں لکھا گیا اور تمام داستان تقریباً چار سال بعد مکمل ہوئی۔ چوّن کتابوں پر مشتمل یہ داستان دو کرداروں ہی کارو گین جی اور اس کے بیٹے کا اور وُدائی شو کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ گین جی ایک شہزادہ تھا جو عمدہ صفات اور قابلیت کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان دونوں کے حوالے سے مختلف طبقوں کی خواتین کرداروں کی حیثیت سے اُبھرتی ہیں اور ان سب کی کردار نگاری ایسے انداز میں کی گئی ہے کہ وہ سب ہماری توجہ اپنی طرف

مبذول کراتی ہیں۔ ان میں کچھ خواتین مردوں کے سامنے بالکل بے بس نظر آتی ہیں اور کچھ اپنے کردار کی مضبوطی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ مصنفہ نے اپنے کرداروں کا گہرا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ اس داستان میں سیاسی زندگی کے بجائے عشقیہ اور جذباتی زندگی کا بیان زیادہ ہے۔ یادداشت، کہانی اور شاعری کی آمیزش نے اس داستان کو وہ حسن عطا کیا ہے جو ہمیشہ اس کو قبول عام بخشتا رہے گا۔

گین جی مونوگاتاری کی کشش کا باعث اس کا شستہ اور حسین انداز بیان اور انسانی زندگی کے عشقیہ اور جذباتی پہلوؤں کا موثر اظہار ہے۔ یہ بات بہت عجیب لگتی ہے کہ یہ داستان گیارہویں صدی میں یعنی شیکسپیئر سے چھ سو سال اور ڈانٹے سے کوئی تین سو برس قبل وجود میں آئی۔ یہ امر "ہے آن" دور کی تہذیبی اور ادبی فضا کی عظمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جاپانی تہذیب و ثقافت پر گین جی مونوگاتاری کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہر زمانے میں اسے ذوق و شوق سے پڑھا گیا۔ آج بھی جاپان میں اس کے مطالعے کے لئے مجلسیں موجود ہیں۔ جدید کہانی نگاروں مثلاً تانی زاکی اور کاواباتا کی تحریروں پر بھی اس داستان کا اثر نمایاں ہے۔

جس ادب کا ذکر ہم اوپر کرتے آئے ہیں وہ تمام تر درباری امراء کی اور خاص طور پر خواتین کی تخلیق تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوامی حلقوں میں بھی ادب تخلیق ہوتا رہا جس کے مخاطب عوام تھے۔ اس ادب میں کونجاکومونوگاتاری سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ عوامی زندگی سے متعلق ہدایات پر مشتمل ہے۔ نصیحت آموز بدھ حکایات کے اس مجموعے کے تین حصے ہیں۔ ان میں سے پہلے حصے میں ہندوستانی، دوسرے حصے میں چینی اور تیسرے میں جاپانی حکایات شامل ہیں۔ پھر جاپانی حکایات کے مزید دو حصے ہیں پہلے حصے میں مذہبی حکایات ہیں اور دوسرے میں دنیاوی۔ حکایات کا یہ مجموعہ آج بھی جاپان میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس کے دنیاوی حصے میں

ایسی حکایات شامل ہیں جو جدید افسانہ نگاروں کے لئے بھی کہانیوں کے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس دور میں روائتی صنف سخن "واکا" کا دوبارہ رواج ہوا۔ یہ صنف سخن "مان یوشو" کی تالیف کے بعد جمود کا شکار ہو گئی تھی لیکن آری ہیرا نوناری ہی را اور دوسرے چھ عظیم شعراء کے کلام کے مجموعہ "کوکین واکا شو" کی تالیف سے اس کو دوبارہ مقبولیت حاصل ہو گئی۔ شہنشاہی فرمان کی رو سے مرتب ہونے والا یہ پہلا شعری مجموعہ تھا جس میں تمام تر "واکا" شاعری شامل ہے۔ اس کو "کی نوسو رایوکی" وغیرہ نے ۹۰۵ عیسوی میں مرتب کیا۔

اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد چینی شعری رنگ سے ہٹ کر جاپانی شعری انداز کا رواج بہت زیادہ ہو گیا۔ اس دور میں اس مجموعہ کے علاوہ سات اور شعری مجموعے مرتب ہوئے۔ آٹھواں مجموعہ جو ان سب سے آخر میں جمع ہوا "شن کوکیں واکا شو" ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۲۰۵ عیسوی ہے۔ ان قدیم شعری مجموعوں میں درباری معاشرت کے روبہ زوال ہونے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن ان میں "مان یوشو" کی شعری روایت جس میں جذبات کا اظہار سادگی اور بے ساختگی سے کیا جاتا تھا، کا سراغ مشکل سے ملتا ہے بلکہ اس شاعری میں تصنع اور فنی تلازمات کی طرف زیادہ زور دیا گیا ہے اور فنی حسن کو مقصود سمجھ لیا گیا۔ "مان یوشو" کی شاعری زندگی سے پھوٹتی اور اس کے گہرے اظہار کا ایک ذریعہ تھی لیکن اس کے برعکس ان مجموعوں کی شاعری زوال پذیر درباری ماحول سے بننے والی ایک الگ دنیا کی شاعری تھی۔ درباری امراء نے اپنی زندگی کے خلاء کو ایک خود ساختہ حسین دنیا سے بدل کر محض فن اور اس کے معیارات کو سامنے رکھ کر شعر تخلیق کئے۔ اس طرح انہوں نے اندرونی علامتی ادب کے سہارے اپنی بے مایہ زندگی کے تضادات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ یہ شاعری زندگی سے فراریت کے رجحان کی پیداوار تھی لیکن اس نے بعد کے جاپانی ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ مان یوشو کی شاعری نے اپنی بے ساختگی اور زندگی کے اظہار کی بنا پر ایک

صحت مند روایت قائم کی۔ بعد کی شاعری میں یہ دونوں رجحانات کبھی ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

متوسط دور کا ادب

خاندان "فوجی وارا" کے زوال کے ساتھ ہی بوشی یا سامورائی جو فن سپہ گری سے متعلق تھے حکومت پر قابض ہو گئے۔ ان میں سے ایک امیر می نامو تو نو یوری تو مونے، جو خاندان گیس جی سے تعلق رکھتے تھے، موجودہ ٹوکیو کے قریب کاماکورا کے مقام پر ۱۱۹۲ء میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد کے چار سو سال تک کے زمانے کو جاپانی تاریخ کا دورۂ متوسط کہا جاتا ہے۔

نئے حکمران خود تخلیقِ ادب میں کم حصّہ لیتے تھے۔ اس دور کا ایک نمائندہ شاعر سا ای گیو ہے جو پہلے فوج سے متعلق تھا مگر بعد ازاں دنیاوی مشاغل سے ہٹ کر بدھ راہب بن گیا اور شعر کہنے لگا۔ حکمران طبقے میں سے صرف ایک بادشاہ می نامو تو نو سانے تومو ہے جس نے شاعری کے ذریعے بوشی طبقے کے سادہ جذبات اور ان کے بہادرانہ مزاج کا اظہار کیا ہے۔ اُس کے شعری مجموعے کا نام کن کائی واکاشو ہے، جو ۱۲۱۳ عیسوی میں مرتب ہوا۔

جنگ نامے۔ گن کی مونو گا تاری

تیرہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل سے جاپانی ادبیات میں ایک نئی صنف کو رواج ہوا جس میں جنگ کے واقعات کا بیان ہوتا تھا۔ ابتداً میں لکھے جانے والے جنگ نامے ہوگین، مونو گا تاری اور ہے اِی جی مونو گا تاری تھے۔ اس صنف کا نمائندہ شاہکار "ہے اکے مونو گا تاری" ہے جو "ہے ای کے" خاندان کے مختصر عروج اور ناگہاں زوال کی داستان ہے۔ اس داستان میں جابجا "ہے ای کے" خاندان کے زمانے کے واقعات اور جنگوں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کا

انداز بیان بیک وقت رزمیہ اور المیہ ہے۔ اس زمانے میں ہر طرف بدھ مذہب پھیل چکا تھا۔ اسی لیے اس میں بہادری سے زیادہ زندگی کی ناپائیداری پر موثر انداز میں زور دیا گیا ہے۔

"جسے عروج ہے، اُس کا زوال یقینی ہے۔ جو غرور کرتا ہے، قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ تمام عالم ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ طاقتور ایک دن ختم ہو جائیگا۔ یہ تمام دنیا اس خاک کی مانند ہے جو آندھی کی زد میں ہو۔" یہ اس داستان کے ابتدائی کلمات ہیں جنہیں داستان گو جگہ جگہ سناتے اور ساتھ ہی بی وا ایک جاپانی آلۂ موسیقی پر المیہ دھن بجاتے۔ اس طرح یہ داستان جاپانی عوام کے ہر طبقے کے دلوں میں گھر کر گئی۔ لوگ اسے سنتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ یہ داستان بنیادی طور پر نچلے درجے کے درباری ادیب کی تصنیف ہے جس میں بعد کے داستان گویوں نے سننے والوں کے تقاضے کے مطابق اضافے اور اصلاح کی۔ اسی لئے اس داستان کے کئی متن ہیں لیکن ان تمام میں ہائکے خاندان کے عروج و زوال کا موثر بیان ہے۔ ایسا عظیم رزمیہ جاپانی ادب میں بے مثال ہے اور بعد کے ادب میں بھی ایسا رزمیہ نہیں لکھا گیا۔ گین جی مونوگاتاری کے برعکس اس زمانے میں جاپانی ادبیات میں عسکری جذبات اور دنیا سے گریز کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ بدھ نظریات کا اثر تھا جس نے بعد کے جاپانی ادب کو بہت متاثر کیا۔ اس دور کا ایک اور نمایاں رزمیہ "تائی ہے ای کے" ہے جو کاماکورا سلطنت کے خاتمے کے بعد کی لمبی جنگ آزمائیوں کی داستان ہے۔ اس زمانے میں شاہی خاندان دو حصوں شمالی اور جنوبی میں تقسیم ہو گیا تھا اور خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی۔ اس داستان کا عنوان یعنی امن کی داستان طنزیہ ہے۔ یہ داستان بھی قصہ خوانوں کے ذریعے کافی مقبول ہوئی۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سی رزمیہ داستانیں لکھی گئیں جن میں گی کے ای کی اور "سوگا مونوگاتاری" مشہور ہیں۔ سوگا مونوگاتاری سوگا خاندان کے دو نوجوان بھائیوں کے اپنے والد کے دشمن سے کامیاب انتقام کی کہانی ہے۔

رزمیہ نگاری کے بعد اس دور کے ادب کی اہم صنف انشائیہ ہے۔ یہ آن دور کے انشائیوں کے مشہور مجموعہ "ماکورانو سوشی" کی روایت کو اس دور کے انشائیہ نگاروں نے اور آگے بڑھایا۔ خاص طور پر کاموتو چومے ای کی کتاب "ہوجوکی یعنی "میری جھونپڑی کا احوال"، اور یوشی داکین گو کی کتاب "سورے زورے گوسا" یعنی "افکار پریشاں" بے حد اہم ہیں۔

ندی میں بہتا پانی کبھی نہیں رکتا لیکن یہ پانی وہ نہیں جو ایک لمحہ پہلے تھا جب پانی کا بہاؤ تھم جاتا ہے تو بلبلے سطح پر نمودار ہو کر ٹوٹتے ہیں اور اگر یہ باقی بھی رہیں، تو زیادہ دیر نہیں رہ سکتے۔ اس میں انسان اور تمام مادی اشیاء کا یہی حال ہے۔" "میری جھونپڑی کا احوال" کے اس اقتباس کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا چاہئے کہ یہ خیالات بدھ عقائد کے نمائندہ ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خیالات اردو شاعری میں میر تقی میر کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔ اس کتاب کا مصنف ایک درباری شاعر ہے جس نے شاہی تہذیب کی شکست و ریخت کا مشاہدہ کیا اور اس نے شہروں میں آگ لگنے، قحط سالی اور زلزلے سے لوگوں کو تباہ حال ہوتے دیکھا۔ اور اپنے دلی زخموں کا الفاظ میں اظہار کیا۔ اس نے خود گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ اسی لئے اس کے ہاں خود کو تسلی دینے اور زندگی سے فرار کی کیفیات نمایاں ہیں۔ اردو شاعری میں یہ خصوصیات شہر آشوب میں پائی جاتی ہیں۔

"چونکہ میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں اس لیے میں سارا دن بے ربط انداز میں جو میرے دماغ میں آتا ہے لکھتا رہتا ہوں۔ مجھے عجیب احساس ہوتا ہے"۔ یہ دوسری کتاب کے ابتدائی کلمات ہیں۔ ان سے مصنف کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ ترک دنیا کے باوجود اس فانی زندگی کی بے شمار چیزوں میں دلچسپی لیتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ یہ دونوں احساسات ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جاپانی عوام کی زندگی میں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے نہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بارے میں یہ رجحان شدید جنگ کے دنوں میں پیدا ہوا۔

ڈراما

نوہ آج بھی جاپان کا مخصوص تھیٹر ہے اور اس کی ہیئت آج بھی تقریباً وہی ہے جو دور متوسط میں تھی۔ شن تو معبدوں میں دیوتاؤں کے سامنے یا اُن کے ساتھ رقص، اور کھیتوں میں پیداوار میں اضافہ کے لئے کسانوں کا رقص، دونوں مل کر اس تھیٹر کی تشکیل کا باعث ہوئے۔ اس صنف کو باقاعدہ فنی شکل دینے میں سب سے زیادہ حصّہ زے آمی نے لیا۔ زے آمی بیک وقت اداکار، ہدایتکار اور ڈراموں کا مصنّف تھا۔ اس کے لکھے ہوئے تقریباً تیس ڈرامے آج بھی موجود ہیں۔ وہ ڈرامے کا ایک نقاد بھی تھا جس نے تھیٹر کی موسیقی، اداکاری، ہدایت کاری کے سبھی پہلوؤں کے بارے میں تخلیقی سطح پر تفصیل سے لکھا ہے۔ جمالیات کے موضوع پر اس کی بہت سی تحریریں آج بھی زندہ ہیں۔

نوہ (ڈراما) میں جو گیت گائے جاتے ہیں انہیں یوکیو کو کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے مواد عموماً تاریخی داستانوں، تاریخی واقعات اور روایات سے لیا جاتا ہے اور خوبصورت الفاظ کے جامے میں اُن کا علامتی اظہار کیا جاتا ہے۔ جمالیات کا یہ معیار یوگین کہلاتا ہے جو انتہائی لطیف اور حسّاس کیفیات کا مظہر ہے۔

اسی زمانے میں عام زندگی کے احوال پر مشتمل مزاحیہ ڈرامے کا بھی رواج ہوا جسے کیوگین کہتے ہیں۔

ایدو دور علم کا احیاء اور شہر کی عوامی تہذیب

دور متوسط کا نصف آخر مسلسل جنگوں کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر ۱۴۶۷ء کے بعد سے گیارہ سال تک زبردست خانہ جنگی رہی۔ اس کے نتیجے کے طور پر توکوگاوا ای اے یاشو ملک کے حاکم اعلیٰ کے طور پر ابھرا اور اس نے تین سو سالہ دورۂ امن کی بنیاد رکھی۔

توکوگاوا سلطنت ایدو یعنی موجودہ ٹوکیو میں قائم ہوئی۔ ان حکمرانوں نے فروغِ علم کو امورِ سلطنت کی بنیاد بنایا۔ چینی کنفیوشس مذہب کی تعلیم عام کی گئی کیونکہ حکمران یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح لوگ اپنے ماں باپ کی خدمت کریں گے اچھے امور اپنائیں گے اور اپنے سے برتر لوگوں کا احترام کریں گے۔ اس طرح جاگیر دارانہ اخلاقیات کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ کنفیوشس کے مذہبی مدرسوں کے ذریعے عام کاشتکاروں، تاجروں کا تعلیمی معیار کافی بلند ہوگیا۔

دوسری طرف کنفیوشس تعلیم کے ساتھ ساتھ جاپانی کلاسیکی ادب کے مطالعے نے اہلِ علم کے درمیان فروغ پایا۔ کوجی کی اور مان یوشو کے بارے میں ازسرِ نو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا۔ جوں جوں یہ تحقیق آگے بڑھی عام لوگوں میں اس بات کا شعور بڑھتا گیا کہ شاہی خاندان سلطنت سے بالاتر ہے اور یہی شعور بالآخر سلطنت کا تختہ الٹنے کا باعث ہوا۔ اس دور کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اقتدار اگرچہ توشی فوجی حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا لیکن رفتہ رفتہ تاجروں کا اقتصادی درجہ بہت بلند ہوگیا۔ یہاں تک کہ حکمران اپنے محکوم تاجروں سے قرض لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس طرح تاجروں کا امورِ سلطنت میں دخل بڑھتا گیا اور معاشرے میں ان کی حیثیت مرکزی ہوتی گئی۔ اس طرح شہروں میں رہنے والوں کی ثقافت نے ترقی کی اور یہی ثقافت آگے چل کر جدید تہذیب کی بنیاد قرار پائی۔

ہائی کو کی نشوونما

"ایدو" دور کی سب سے ممتاز صنفِ سخن "ہائی کو" ہے۔ یہ ایک مختصر نظم ہے

جو صرف سترہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے تین مصرعے ہوتے ہیں۔ اس صنفِ سخن کی بنیاد "مان یوشو" میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یاد رہے کہ اس میں قافیہ اور ردیف نہیں ہوتے جو کہ فارسی اور اردو کی قدیم شاعری میں ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ مان یوشو کی ہیئت "واکا" ہے جسے اگر مسلسل لکھا جائے تو اسے رینگا کہا جاتا ہے۔ فوجی امراء اور سردار میدانِ جنگ میں فرصت کے اوقات میں جامِ شراب ہاتھوں میں لئے کر رینگا کہتے اور لطف اندوز ہوتے۔

اس صنف کے ابتدائی حصے نے زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل کر لی اور اسے ہوکُو کہا جانے لگا۔ بعد ازاں اسی ہوکُو نے الگ صنفِ سخن کی حیثیت حاصل کر لی جو موجودہ "ہائی کو" کی شکل میں موجود ہے۔

ہائی کو کو ادبی اور فنی اعتبار سے مستحکم اور مستقل بنانے میں مات سو اور باشو نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس شاعر کا فن گین روکو دور کے شروع میں اپنے کمال کو پہنچا اور یہی وہ زمانہ ہے جب ایڈو تہذیب اپنے عروج پر تھی۔

"باشو" کو سیر و سیاحت سے عشق تھا اور اس نے سفر میں ہی اپنی زندگی گزار دی۔ شاید مناظرِ فطرت کی جستجو اُس کی شاعری کے لئے ضروری تھی۔ اس کے پانچ سفرنامے ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ ان میں سے آخری "اوکو توہوسومی چی" یعنی تنگ اندرونی راستے" جسے عموماً "شمال کو سفر" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے شمال مشرقی علاقے کے سفر کی یادداشتوں اور اس دوران کہے گئے ہائی کو پر مشتمل ہے۔ یہ اس کا سب سے مقبول اور نمائندہ شاہکار ہے۔

بہار گزراں ہے۔
پرندہ پکارتا ہے اور آنسو باقی ہیں۔
مچھلی کی آنکھ میں۔

یہ "ہائی کو" باشو کے اُن خیالات کا آئینہ دار ہے جو دارالحکومت ایڈو (موجودہ ٹوکیو) سے روانہ ہوتے وقت اُس کے دل میں تھے۔ باشو کی شہرت اُس زمانے میں عروج پر تھی۔ شہروں سے دور دیہی علاقوں میں بھی لوگ اس کی آمد کا انتظار کرتے رہتے

تھے ۔ وہ زیادہ تر عام دیہاتی معززین یا تاجر ہوتے تھے ۔ وہ اُن کے گھر ٹھہر کر اپنا کلام سناتا۔ ان کے کلام پر اصلاح دیتا اور اپنا سفر جاری رکھتا۔ ۱۶۹۴ عیسوی میں جب کہ وہ اوساکا میں اپنے ایک شاگرد کے ہاں قیام پذیر تھا وہ اچانک بیمار ہوگیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

باشو کی شاعری میں پنہاں جمالیاتی احساسات کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن عام طور پر ان فنی تصورات کی "وابی" سابی" اور کارومی اصطلاحات کے ذریعے وضاحت کی جاتی ہے ۔ ایک طرف یہ اصطلاحات اُس زمانے کے شہری تمدن کی عکاسی کرتی ہیں اور دوسری طرف یہ دورۂ متوسط کے یوگین کی روایت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ سابی کا مفہوم خلوت سے قریب تر ہے کہ اس تنہائی کے ساتھ ساتھ شان و شوکت اور دبدبے کا احساس بھی شامل ہے۔

وابی حُسن کے احساس کی وہ شکل ہے جو روزمرہ زندگی اور گردوپیش کی اشیاء میں دکھائی دیتا ہے۔

جب کہ سابی ادبی اور فنی حُسن کی علامت ہے ۔ کارومی سے مراد اشیا کا ہلکا اور بے وزن ہونا ہے۔ اس سے باشو کے ہاں اسلوب کی سادگی اور مضمون کی لطافت دونوں کا اظہار ہوتا ہے ۔

باشو کی وفات سے تقریباً سو سال بعد ایک اور باکمال شاعر" یوسابوسوں" نے "ہائی کو" کو ایک نیا اسلوب بخشا۔ اس کے اشعار اپنی فنی تشکیلات کے باعث بے پناہ تاثر کے حامل ہیں۔

زرد سرسوں پھوٹ رہی ہے۔
مشرق سے چاند طلوع ہوتا ہے۔
مغرب میں سورج ڈگمگاتا ہے۔

ان دنوں کے بعد ایدو دور کے آخری زمانے میں کوبایاشی اسانے مظلوموں اور بے بس لوگوں کے لئے ہمدردانہ خیالات پر مشتمل ہائی کو کہے۔ یہ شاعر تمام مخلوقات کے لئے دردمند دل رکھتا تھا۔

اید و دور کے نصف اوّل کا نمائندہ ناول نگار" اہی ہار اسائی کاکو" اور نصف آخر کا "تاکی زاوا باکن" تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اید و دور تاجروں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا حامل تھا۔ اس زمانے میں ناول کے لئے نئے قارئین کا ایک طبقہ پیدا ہوا۔ "سائی کاکو" خود اوساکا کے ایک تاجر خاندان کا فرد تھا۔ اس نے ہائی کو کہنے والے شاعروں کے برعکس لوگوں کی توقعات پورا کرنے پر زیادہ توجہ دی۔ اس نے محبت اور ہوس کے موضوع پر شہریوں اور فوجی سرداروں کی زندگی کے حوالے سے کئی کہانیاں اور ناول لکھے۔ چونکہ اس کا اسلوب حقیقت پسندانہ تھا اس لئے اس نے انسانی ہوس اور لالچ کی سچی تصویریں کھینچیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا موازنہ اکثر فرانسیسی ناول نگار بالزاک سے کیا جاتا ہے۔ شہر میں رہنے والے تاجر جو روپے کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے ان کے بارے میں "سائی کاکو" کی کہانیاں اُس دور کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہیں۔

"تاکی زاد باکن" ایک فوجی خاندان کا چشم و چراغ تھا لیکن اس نے اپنی تمام زندگی ادیب کے طور پر بسر کی اور اس نے کئی ناول لکھے۔ اُس کا شاہکار ساتومی ہاکین دین اس کی زندگی کے آخری اٹھائیس سال میں تصنیف ہوا۔ یہ ناول ساتومی خاندان کے آٹھ کرداروں کی زندگی پر مبنی ہے۔ اُس کے ناول لکڑی کی پلیٹوں کے ذریعے چھاپے گئے۔ اسی لئے ان کی بہت سی نقلیں تیار ہوتی تھیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں، کہ ناول نگار کی پیشہ ورانہ حیثیت اسی زمانے میں متعین ہوئی۔ بہر حال اس بے پناہ مقبولیت کے باوجود اس کی زندگی مفلسی میں بسر ہوئی۔ اس کو ناشر کی طرف سے زیادہ مقبول اور تفریحی ناول لکھنے کی فرمائش موصول ہوتی اور وہ سخت محنت کر کے پینتالیس سال کی عمر سے اپنی زندگی کا یہ کارنامہ مکمل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اسی کی نذر ہو گئیں۔ اس کے بعد اس ناول کی تکمیل اُس نے اپنی بیٹی کے ہاتھوں لکھوا کر کی۔

اس دور میں مزاحیہ کہانیوں میں بھی عوام کی دلچسپی بڑھی۔ ایسی کہانیاں لکھنے والوں میں "جپنسن شاکو" سب سے اہم ہے۔ اس کے کردار" یاجی سان" اور" کی تاسان" آج بھی مزاحیہ کرداروں کی حیثیت سے مقبول ہیں جیسے اردو ادب میں" آزاد" اور" خوجی"۔

ایدو دور میں تھیٹر کی سب سے مقبول اقسام "بن راکو اور" کابوکی" تھے۔ بن راکو موسیقی، بیان اور کٹھ پتلیوں کے تماشے سے مل کر تخلیق ہوتا ہے۔ موسیقی اور بیان کو ملاکر جو رُوری کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے بہتر مصنف چی کا ماتسو مونزائے مون ہے۔ اس کے لکھے ہوئے ڈرامے اتنے خوبصورت اور دلکش ہیں کہ دلوں میں اتر جاتے ہیں اس کے ڈراموں کا موضوع عاشق اور معشوق کی خودکشی ہے۔ وہ جاگیردارانہ دور کی بے جا پابندیوں اور زندگی اور موت کے بارے میں جاپانی نظریات کا اظہار کرتا ہے۔ جاپانی لوگ نہ صرف زندگی کے بارے میں بلکہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی موت کے طریقے کے بارے میں بھی سوچتے ہیں۔ معاشرتی پابندیوں کے باعث محبت کرنے والے اگر ایک دوسرے سے وصل نہ حاصل کر سکیں تو وہ اس سہارے کہ موت کے بعد وہ اگلے جہاں میں ایک دوسرے سے مل سکیں گے ایک ساتھ مرنے کا عہد کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہوئے خودکشی کر لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ اُن کی جواں مرگی پر ہمدردی اور غم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی داستان کو خوبصورت قرار دیتے ہیں۔

شاندار موت کا تصور جو خودکشی کی اخلاقی عظمت پر مبنی ہے، پاکستان کے اور ہندوستان کے لئے شاید اجنبی اور ناقابلِ فہم ہو۔ اس کا باعث اسلام کی تعلیمات ہیں جن کی رو سے خودکشی حرام ہے لیکن جاپان کی تہذیبی فضا میں موت اور حیات کو تقسیم کرنے والی حد بے حد مختصر ہے۔ خودکشی کا انتخاب کوئی ممنوعہ عمل نہیں ہے کیونکہ روح کی صداقت کا اظہار صرف المیہ کی شکل میں ممکن ہے اسی لئے یہ ادبیات کا موضوع بن گئی۔

بن راکو تھیٹر نے ایدو دور کے ابتدائی حصے میں ترقی کی لیکن بعد ازاں کابوکی نے جو کہ زیادہ مدوّن فن ہے بے حد مقبولیت حاصل کر لی ۔ اس دور کے نصف آخر میں شہروں میں باقاعدگی سے کابوکی کا تماشا ہوتا۔ دیہاتوں میں بھی میلوں کے موقعہ پر لوگ کابوکی دیکھتے اور کسان خاص طور پر اس میں حصہ لینے کا شوق رکھتے تھے۔

کابوکی کے مصنفین میں کاواتکے مُوکوآمی سب سے مشہور ہوا۔ اس نے

تقریباً تین سو سے زائد ڈرامے لکھے جو آج بھی سٹیج کئے جاتے ہیں۔

جدید دور

جاپان میں جدید دور کا آغاز "میے اے جی" سلطنت کے قیام (۱۸۶۸-۱۹۱۲) سے ہوتا ہے۔ توکوگاوا سلطنت جو کافی عرصے تک رہی بالآخر ختم ہوگئی اور نئے جاپان کا ظہور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب و تمدّن اور مغربی فوجی طاقتوں کا اثر بڑھنے لگا۔ ڈھائی سو سال تک دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے بعد جب جاپانیوں کی آنکھیں مغرب کے ترقی یافتہ تمدّن سے دو چار ہوئیں تو وہ حیران رہ گئے۔ جاپان کی قیادت جاپان کو مغربی بنا دینا چاہتی تھی اس لئے اس زمانے میں جاپان کی اپنی روایات کو فرسودہ سمجھا جانے لگا۔

اسی زمانے میں ایک جرمن طبیب نے اپنے سفر کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ جاپان ایک ایسا ملک ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور اس تاریخ کا آغاز ابھی ہوا ہے۔ یہ رائے بالکل غیر معمولی نہیں کیونکہ اس زمانے کا ہر تعلیم یافتہ آدمی اس خیال کا حامل تھا۔ اُن کی نظر میں مغرب کی ہر چیز اچھی تھی۔ مغرب کی صنعت ہی نہیں بلکہ لباس، خیالات و افکار، آدابِ لباس و طعام ہر چیز قابلِ تقلید تھی اور ہر شخص ان کو اختیار کرنے کی کوشش میں نظر آتا تھا۔ اس اندھی تقلید سے کوئی نئی تہذیب جنم نہ لے سکتی تھی۔ اسی لئے "مے ای جی" دور کے ابتدائی بیس سال میں جاپانی ادب میں محض تقلید کی وجہ سے تضادات اور بے روح جمود نظر آتا ہے۔

۱۸۸۷ء میں "فوتا باتے ای شی مے" نے اپنا ناول "اوکی گوموُ" لکھا۔ اس ناول کی اہمیت روزمرّہ زبان اور لوگوں کے عام مسائل اور مشکلات کو اپنا موضوع بنانے کی وجہ سے ہے، اگرچہ فنی طور پر کوئی کامیاب تخلیق نہیں ہے۔ "فوتا باتے ای" نے اپنے مطالعے کے زیرِ اثر روسی ناول نگاروں کو اپنے لئے نمونہ بنایا۔ ایک اور مشہور ادیب "موری اوگائی" جب جرمنی سے طبّی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آیا تو

اس نے جدید مغربی ادبی تصورات کو جاپان میں متعارف کرایا۔ اس نے مغرب کے ناول اور ڈرامے کو جاپانی میں ترجمہ کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ اور اس کے کارناموں نے جاپانی ادب کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں بتدریج جاپانی ادب کے احیاء کے آثار نظر آنے لگے۔ اوزاکی کویو اور "کوداروہن" اس زمانے کے نمائندہ ناول نگار ہیں۔ تاہم جدید جاپانی ادب میں پہلی بار "ہی گوچی ای چی یو" ایک خاتون ناول نگار نے بھرپور ذہانت اور فنی پختگی کا معیار قائم کیا۔ اس کی لکھی ہوئی دس کہانیاں اور ڈائری آج بھی قبول عام رکھتی ہیں۔ اس کا انتقال چوبیس برس کی عمر میں ہوا۔ زبان کی قدامت کے باوجود اس کی تحریریں زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر ہیں اسی لئے وہ آج بھی ہم عصر ادب کی طرح پڑھی جا سکتی ہیں۔

ایک طویل عرصے تک "ہائیکو" بھی جمود کا شکار ہو گیا تھا اور اس کے لئے ایک ایسے باکمال کی ضرورت تھی جو اس میں نئی روح پھونک سکتا۔ اس ضرورت کو "ماساوکا شی کی" نے پورا کیا۔ آج بھی ہائی کو کے اسالیب اس کے زیر اثر ہیں۔ اسی زمانے میں "یوسانو تیکان" نے روائتی صنف سخن "تن کا" کو نئی زندگی عطا کی۔ اس نے "میوجو" کے نام سے ایک ادبی مجلہ جاری کیا جو نئے شاعروں کے گروہ کا ترجمان تھا۔ "ای شی کاواتاکوبوکو" بھی اسی گروہ سے متعلق تھا۔ "یوسانو تیکان" کی بیوی "آکی کو" نے بھی اسی زمانے میں ایک اہم شاعرہ کی حیثیت سے جاپانی شاعری میں بے پناہ اضافہ کیا۔

"مے جی ای" دور کے اختتام تک بے شمار ناول نگار ابھرے۔ ان میں "شیمازاکی توسون"، "تایاما کاتائی"، "ماسامونے ہاکوچو" اور "توکوداشوسے ای" نے انسانی وجود کے تجربوں کو بجنسہٖ بیان کیا۔ عام طور پر انہیں نقاشِ فطرت کہا جاتا ہے۔

جاپانی فطرت نگار زندگی کو جیسی کہ وہ ہے بیان کرنے کو اپنا مقصد بناتے تھے۔ اس لئے اُن کی تحریریں خود نوشت سوانح یا جاپانی انشائیہ سے قریب تر ہوتی گئیں۔ ان کی نگارشات میں کہانی کا عنصر کم ہے۔ دراصل جاپان میں کہانی کی تکنک کے معیارات کی طرف توجہ کم دی گئی ہے اور اس عنصر کے بغیر لکھنے کی روایت زمانہ قدیم سے چلی

آتی ہے اور اسے بھی ناول ہی کہا جاتا ہے۔ ہر چند کہ بہت سے مکتبِ فکر اس کے علاوہ بھی ہیں۔

ایک مشہور ناول نگار ناگائی کافو نے امریکہ اور فرانس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان ملکوں میں اپنے تجربات کی بنیاد پر ناول لکھے۔ یہ ناول بالکل مغربی انداز کے حامل تھے۔ لیکن ایک دلچسپ اور اہم واقعے نے اس انداز کو بالکل تبدیل کر دیا۔ ایک دہشت پسند کوتوکو شوسی جو کہ مضمون نگار بھی تھا، نے شہنشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس واقعے سے ملک کی ادبی فضا بھی بے حد متاثر ہوئی۔ اس بنا پر سوشلسٹ خیالات رکھنے والوں کو گرفتار کر کے انہیں سزا دی گئی۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر "ای شی کاوا تاکو بوکو" نے نظمیں لکھیں جن میں جبر اور استحصال کے خلاف دہشت پسندوں کی جدوجہد اور ان کے جذبۂ آزادی کی تحسین کی گئی تھی، اور ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تھا۔ اس واقعے کے بعد "ناگائی کافو" نے وہی کیا جو ایدو دور کے لکھنے والوں نے کیا تھا۔ اُس نے سیاست سے ہٹ کر زوال پذیر فنی حسن کے بیان کے لئے اپنی صلاحیتوں کا استعمال شروع کیا۔ اُسے کبھی "تانی زاکی جون ای چی رو" کے ساتھ بھی ملایا جاتا ہے اور حقیقت یہ بھی ہے کہ ان دونوں لکھنے والوں نے حسن کی تلاش میں اپنی تمام تر کاوشیں وقف کر دی تھیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا موری اوگائی نے مغربی ادب کو رائج کرنے کے لئے بحیثیت ادیب و نقاد بے پناہ کام کیا۔ جاپان میں وہ آج بھی ناول نگار کے طور مقبول ہے۔ خاص طور پر اُس کے تاریخی ناول بہت پسند کئے جاتے ہیں لیکن اپنے دقیق اظہار کی بنا پر مغرب کے نقادوں سے داد نہ لے سکا۔ اس دور کا سب سے زیادہ مشہور ناول نگار "ناتسومے سوسے کی" تھا۔ اُس کے دو مزاحیہ ناول "واگا ہائی وانیکو دے آرو" اور "بوچان" جاپان کے مقبول ترین ناولوں میں شمار ہوتے ہیں اور تقریباً ہر پڑھا لکھا جاپانی اپنے اسکول کے زمانے سے ہی پڑھ چکا ہوتا ہے۔

جاپانی روایات کے مطابق شہنشاہ کے بدلنے کے ساتھ دور کا نام بھی بدل

جاتا ہے۔ مے ای جی دور کے خاتمے کے بعد "تائی شو" دور اپنے جلو میں جاپانی ادب کی تعمیر اور ارتقائے کر آیا۔ مے اے جی اور تائی شو دور کے درمیانی عرصے میں ایک نئی ادبی تحریک نے جنم لیا جو ایک رسالے "شیرا کا با" میں لکھنے والوں نے شروع کی۔ اس کا رہنما "موشا لو کوجی سانے آتسو" تھا۔ یہ گروہ انسانیت پرست تھا۔ اس میں اونچے طبقے کے لوگ زیادہ شامل ہوئے۔ "شی گا ناویا"، "آری شی ماتا کپے او"، "ساتومی توں" اور "ناگا یو یوشی او" اس تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والے مشہور ادیب تھے۔

ادیبوں کا یہ گروہ اپنی لمبی عمروں کی وجہ سے بھی نمایاں ہے۔ ان میں سے "آری شی ما" مستثنیٰ تھا کیونکہ اس نے جوان عمری میں ہی ایک خوبصورت عورت کے ہمراہ خودکشی کر لی۔ وہ ابتدائی عمر سے ہی سماجی مسائل کے بارے میں فکرمند رہا کرتا تھا۔ اُس نے اپنا کھیت اپنے مزارعوں کو دے دیا۔ "قائین کے ورثا" اس کا شاہکار ناول ہے۔

شاید تائی شو دور کا نمائندہ ادب "آکوتا گاوا ریونوسوکے" کے لکھے ہوئے افسانے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا افسانہ نگار تھا۔ اُس نے اپنی کہانیوں کے لئے قدیم جاپانی داستانوں سے مواد حاصل کیا اور اپنے فنی کمال کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۲۷ء میں اُس نے خودکشی کی اور اس کی وجہ ایک بے معنی اضطراب کو قرار دیا۔

اس دور کے آخر میں پہلی جنگِ عظیم اور انقلابِ روس کے اثرات جاپان تک پہنچے اور اس طرح جاپانی ادب میں سوشلسٹ اور ترقی پسند رجحانات نمایاں ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء سے شووا دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے شروع میں بہت سے نئے لکھنے والے اور نئے اسالیب ظہور میں آئے۔ ایک طرف ادب برائے زندگی اور دوسری طرف ادب برائے ادب کے علمبردار میدان میں آئے۔ ۱۹۲۹ سے ۱۹۳۰ تک کا زمانہ ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں بہت سے مشہور ادیبوں نے انقلابی

ادب تخلیق کیا جن میں کوباشی تاکی جی توکوناگا سوناؤ اور فوجی وارا کورے ہی تو بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے اول الذکر تین سال بعد قید خانے میں تشدد کے باعث مرگیا۔ اس رجحان کے برعکس ایک گروہ ادب برائے ادب کا علم بردار تھا۔ اس تحریک میں یوکومت سوری ای چی اور اس کے ساتھی شامل تھے اور یہ لوگ خود کو نئے احساسات کا دبستان کہتے تھے۔ اس تحریک کا ایک قابلِ قدر نمونہ" کاوا باتا یاسوناری" کا مشہور ناول" ای زونواودوری کو" ہے۔ تائی شو دور کے لکھنے والے بھی اس دور میں ادب تخلیق کرتے رہے۔ شیما زاکی توسون" تانی زاکی جون ای چی رو" اور ناگائی کافو نے اپنے بہترین ناول اس دور میں تصنیف کئے۔

تائی شو دور امن کا زمانہ تھا لیکن جنگی طاقت کے اضافہ کے ساتھ ہی شووا دور میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تاریکی کے اس دور میں کچھ نئے لکھنے والے پیدا ہوئے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ زمانہ ادب کی تخلیق کے لئے سازگار نہیں تھا۔ چین کے ساتھ جنگ کے دوران بہت ادیبوں کو میدانِ جنگ میں بھیجا گیا اور انہوں نے جنگ کے رپوتاژ لکھے لیکن یہ ادب نہیں تھا۔ صرف ایک ادیب ہی تو آشی ہے ای کی تصنیف" گندم کے کھیت اور فوجی جوان" فنی طور پر کامیاب رہی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایک دم احساس ہوا کہ جیسے ادب کے سب پھول ایک ساتھ کھل پڑے ہوں۔ جنگ کے دوران ناگائی کافو اور تانی زاکی نے الگ تھلگ رہ کر ادبی تخلیق کا عمل جاری رکھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی یہ سب کارنامے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ اسی طرح کاوا باتا نے بھی اپنی زندگی کا بیشتر کام اسی زمانے میں شائع کر دیا جس میں اس نے جنگ کے بعد کے جاپان کی تصویر کھینچی۔ جنگ کے خاتمے پر نئے لکھنے والوں کا ایک گروہ نمودار ہوا جس میں" نوما ہیروشی"،" اومے زاکی ہارو" "مشی شی مایوکیو"، "تاکے داتائی جون" اور "شیماؤتوشو" وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام لکھنے والوں نے جنگ کو شروع سے آخر تک دیکھا اور ان کی تحریروں پر جنگ کے تجربے کا اثر نمایاں ہے۔ اومے زاکی اپنے

ناول "جیری کا جزیرہ" میں ایک فوجی چھاؤنی کے شب و روز کا بیان کرتا ہے جو جاپان کے ایک جزیرے میں موجود ہے اور تفصیل کے ساتھ ان تلخیوں کا ذکر کرتا ہے جو لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔ اووکا نے اپنی تصنیف "اسیرِ جنگ" میں ایک فوجی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ محاذ پر فاقہ کشی اور مشقت سے نڈھال سپاہیوں کی دشمن کے ہاتھوں اسیری کی داستان پوری جزئیات کے ساتھ بیان کی ہے۔ ایک اور ناول "میدان میں آگ" میں اُس نے ایک فوجی کے میدانِ جنگ کو جاتے ہوئے اس کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے بیان کرنے کی صلاحیت اور انسانی صورتِ حال کا تجزیہ ایسی چیزیں ہیں جو اُس کی تصانیف کو بین الاقوامی معیار پہ لے آئی ہیں۔

اس کے برعکس جوانی میں ہی شیما کا جنگ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس نے اپنے ایک ناول میں اپنی ہم جنس پرستی کا برملا اظہار کیا جس پر بہت سے لوگوں کو صدمہ پہنچا۔

جنگ کے اثرات سے جاپانی معاشرہ تضادات کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف پرانی روایات تھیں جو ختم نہیں ہوئی تھیں اور دوسری طرف نئے رجحانات مستحکم نہیں ہو پائے تھے۔ اس کشمکش کی شدت ذرا کم ہوئی تو لکھنے والوں کو بھی زندگی کے روزمرہ معمولات اور ان کے پوشیدہ زاویوں کا تجزیہ کرنے کا موقعہ ملا۔ ان لکھنے والوں میں یاسو کا شوتارو اور یوشی یوکی جنوسو کے قابل ذکر ہیں۔ آگاوا ہیرو یوکی نے جنگ کے زمانے میں اپنی جان گنوا کر دشمن کو ضرب لگانے کے جذبات کا بیان کیا ہے۔ ایک اور ہم عصر این دو شوساکو نے انسانی برائیوں کا کیتھولک عقیدے کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے۔ وہ اپنے ابتدائی زمانے میں ہی تراجم کے ذریعے مغربی دنیا میں متعارف ہو گیا تھا۔

نئی نسل کے ناول نگاروں میں کائی کو تاکے شی اور اوے کین زابورو اور مقبولِ عام ادب میں "اتسو کی ہیرو یوگی" توجہ کے مستحق ہیں۔

مسعود احمد دہلوی

میرے ابا جان

دوسری جنگِ عظیم سے چند سال قبل ہوش کی آنکھیں جب کھلیں تو اتنا یاد ہے کہ ہم بھائی اور بہن اپنی والدہ اور ابا کے ساتھ کھاری باؤلی میں کوچہ نواب مرزا کی گلی بتاشوں والی میں ڈپٹی صاحب کی حویلی کے زنانے گھر کی تیسری منزل پر رہا کرتے تھے۔ یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ کنبے کے لڑکے بالے عورتوں اور بچوں سمیت گھر کی دوسری منزل میں، دائیں، بائیں اور آمنے سامنے کے کمروں میں آباد تھے پہلی منزل میں اللہ بخشے ہماری دادی اماں، دو چھوٹے چچا اور تین پھوپھیاں، دالان اندر دالان میں جنہیں سامنے کے در بند کروانے کے بعد کمروں میں منتقل کر دیا گیا تھا، سکونت پذیر تھے۔ سارے کنبے کا کھانا ایک جگہ پکتا تھا۔ باورچی، روٹی پکانے والی بوا۔ اوپر کے کام کے لیے لڑکے ملازم تھے۔ بیٹے بہوئیں، پوتے، پوتیاں، غرض خوب چہل پہل رہا کرتی تھی۔

زنانے اور مردانے گھروں کے درمیان والا مکان، کھڑکیوں والا گھر کہلاتا تھا۔ یہ مولوی اشرف حسین صاحب کا مکان تھا جو ہمارے خاندان ہی کے بزرگوں میں سے تھے۔ مردانے مکان میں صدر دروازے سے داخل ہو کر الٹے ہاتھ کو جو سیڑھیاں اوپر دوسری منزل کی جانب جاتی تھیں، انہیں عبور کر کے بڑی سی انگنائی دے کر ایک لمبا مستطیل کمرہ تھا، یہی "ساقی" کا دفتر تھا، جہاں ابا صبح چلئے کے بعد چلے جاتے تھے۔ سارے دن یہاں لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس کمرے سے متصل انگنائی سے گزر کر مقابل

میں اتنا ہی بڑا ایک اور کمرہ تھا جس میں "ساقی" کے منیجر منشی کرم الٰہی اور تین عدد کاتب بیٹھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں میز کرسی کا زیادہ رواج نہ تھا فرشی نشست ہوا کرتی تھی۔ صاف شفاف سفید چاندنی کا فرش گاؤ تکیے دیواروں سے لگے ہوئے۔ ابّا دوزانو بیٹھ کر کتابت شدہ کاپیاں دیکھتے مضامین کے مسودے پڑھتے، کتابوں کا مطالعہ کرتے اور یونہی بیٹھے لکھتے بھی رہتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد واپس دفتر میں ڈاک دیکھنے جاتے۔ "ساقی" کی ڈاک میں بے شمار خطوط، مضامین کے پلندے، کتابوں کے پیکٹ، رسالے اخبارات اور نہ جانے کیا کچھ آتا تھا۔ ڈاک منشی کرم الٰہی وصول کرتے تھے۔ پھر ترتیب سے لگا کر ابّا کو دیتے۔ ابّا ڈاک لے کر اپنے کمرے میں آجاتے۔ ساری ڈاک غور سے دیکھتے تھے۔ خطوط کے جواب لکھتے۔ پھر ڈاک میں آئے ہوئے رسائل کا جائزہ لیتے۔ کبھی کبھی کوئی مضمون پڑھتے لیٹ جاتے، آنکھ جھپک جاتی۔ ظہر کی نماز کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے یا پھر منشی کرم الٰہی کے کمرے میں جا کر ان سے باتیں کرتے، ہدایات دیتے۔ کاتبوں سے بھی کتابت کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے عصر کی نماز کے وقت چائے پینے زنانے گھر میں آتے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر میٹھا سلونا چکھتے، چائے پیتے۔ ہم بھائی بہنوں میں سے کوئی نہ کوئی انکی گود میں چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ ابّا کو ہم سب بچّوں سے بہت محبت تھی۔ شفقت سے سب کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے، باتیں کرتے، ہماری نازیبا حرکتوں یا کسی بدتمیزی پر ناراض ہونے کے بجائے شفقت بھری نظروں سے دیکھتے۔ بس ہمارے لئے اتنا اشارہ ہی کافی ہو جاتا، ہم جاتے، حرکت پر نادم ہو جاتے تھے۔ ابّا نے کبھی بھی کسی بچے کو اونچی آواز سے نہیں ڈانٹا ڈپٹا۔ شرارت پر مارنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہم سب کے سب ابّا سے ڈرتے تھے ان کی موجودگی میں

کیا بڑا کیا چھوٹا ، کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی ۔

ہماری اماں بیمار تھیں ، یاد نہیں کب سے ان کی پیٹھ میں دائیں رُخ اوپر کی جانب ایک ناسور ہو گیا تھا ۔ ابا اپنے ہاتھ سے زخم کی مرہم پٹی کرتے تھے ۔ یہ عمل صبح سویرے اور شام باقاعدگی کے ساتھ روز کا معمول تھا ۔ اماں بہت صبر والی تھیں ۔ بڑی سمائی تھی ان میں ۔ انہوں نے بہت تکلیف اٹھائی ۔ اسی حالت میں ہم سب کا خیال رکھنا ، مہمان داری ، غرضکہ سب کام کیا کرتی تھیں ۔ ابا ان کا بہت خیال رکھتے تھے ۔ انہیں اماں سے بے پناہ محبت تھی ۔ انہوں نے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے معائنے کروائے مگر مرض قابو میں نہیں آیا ۔ انتقال سے کچھ عرصے پہلے اماں ہم سب بچوں کو لے کر اپنی بڑی ہمشیرہ کے گھر حویلی اعظم خاں آگئیں تھیں ۔ ابا صبح ناشتہ کرنے کے بعد کھاری باؤلی دفتر ساقی چلے جاتے اور عصر کے وقت تک واپس آجاتے تھے ۔ اماں کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی ۔ مستقل بخار رہنے لگا تھا ۔ بستر ہی پر لیٹے لیٹے سب بچوں کو محبت بھری آنکھوں سے تکا کرتی تھیں ۔

اس وقت بچوں میں سب سے چھوٹا ہمارا بھائی بمشکل چند ماہ کا تھا ۔ ایک دن پچھلی رات کا پہر تھا کہ کسی کے رونے سے آنکھ کھل گئی ۔ اماں ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر سدھار گئیں ۔ کہرام مچ گیا ۔ منہ اندھیرے ہی سارے کا سارا گھر ، رشتے ، کنبے کے عزیز دل سے بھر گیا ۔ جو بھی آتا ہم میں سے ایک ایک بچے کو سینے سے لگاتا ۔ انہیں روتا دیکھ کر ہم سب اور ڈھاریں مار مار کر روتے ۔ ابا کا غم سے بُرا حال تھا ۔ پھر بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھے ۔

میت کو غسل دیا گیا ۔ کوری چٹائی پر کفن میں ملبوس اماں کا جسدِ خاکی یوں بے حس و حرکت تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ان کی آنکھ لگ گئی ہے ۔ سب نے آخری دیدار کیا ۔ لوگ جنازے کو کندھوں پر اٹھائے قبرستان کو روانہ ہوئے ۔ مجھے وہ وقت آج بھی یاد ہے ، یوں جیسے یہ بات کل ہی ہوئی تھی ۔

خاندان کے بزرگوں بڑے بوڑھوں کے زور دینے پر ابا قبلہ نے دوبارہ شادی کرلی تاکہ بچے ماں کی شفقت سے محروم نہ رہ جائیں۔ ابا سب بچوں سمیت اب حویلی اعظم خاں ہی میں جاکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

جب ہماری اسکول کی عمر آئی تو ابا نے دلی کے اعلیٰ ترین انگریزی پبلک اسکولوں میں سب کو داخل کر دیا۔ بڑے بھائی کو اور مجھے کیمبرج میں اور تینوں بہنوں کو کوئین میری گرلز اسکول دریا گنج میں۔ ہماری دلجوئی کے واسطے ابا نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ہر سال اسکول کی تعطیلات کے زمانے میں ابا سب کو پُرفضا پہاڑی مقامات پر سیر و تفریح کے لیے لے جاتے تھے۔ دو تین ماہ خوب گھوم پھر کر واپس آتے، کبھی ڈیرہ دون تو کبھی مسوری اور کبھی شملہ۔ بعد میں تو ابا نے شملے میں ہمارے واسطے ایک خوبصورت بنگلہ خرید لیا تھا جہاں ہم برِصغیر کی تقسیم تک ہر سال جایا کرتے تھے۔ ابا چند روز کے لئے آتے، پھر واپس دلی چلے جاتے۔ ہماری والدہ اور ہم سب اور ہمارے ملازمین شملہ پہاڑ پر ساری چھٹیاں گزار کر جب دلی کی جھلستی گرمی میں واپس جاتے تو شملہ بہت یاد آتا۔

لکھنے پڑھنے اور مطالعے کے بعد جو وقت نکلتا، ابا اسے اپنے کلاسیکی موسیقی کے شوق کو پورا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ اس لطیف فن کو انھوں نے علم کے طور پر سیکھا اور سمجھا۔ شوق، لگن اور ذہانت سے اس علم پر اتنے حاوی ہو گئے کہ ایک وہ وقت آیا کہ پیشہ ورانِ فنِ موسیقی ان کے روبرو زانوئے ادب طے کرنے لگے۔

باہر سے جب بھی کوئی ادیب، شاعر دلی آتا تو ابا اس کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ دلی کے کسی نامی باورچی کو بلواتے اور اس سے لذیذ کھانے پکواتے۔ مہمان کو ملوانے کے لئے دلی کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسی ایسی شاندار دعوتیں یاد آتی ہیں کہ جن کا بیان یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ صرف چند مہمانوں کے اسمائے گرامی یاد رہ گئے ہیں:

مرزا عظیم بیگ چغتائی، میاں ایم اسلم، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو،

ن۔ م راشد، عصمت چغتائی، پطرس بخاری، شاہد لطیف، سید امتیاز علی تاج، اوپیندر ناتھ اشک، میراجی، راجہ مہدی علی خاں، عبدالمجید سالک، پروفیسر مرزا محمد سعید، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، بہزاد لکھنوی، فیض احمد فیض، آغا محمد اشرف اور جناب غلام عباس

کلاسیکی موسیقی کی محفلیں بھی اسی آن بان کے ساتھ منعقد ہوا کرتی تھیں اپنے چھٹپن کے زمانے میں مجھے یاد ہے، بڑے بڑے کلاونت اور استادوں کو ان نجی محفلوں میں دیکھنے اور سننے کا شرف حاصل ہوا۔ ابا باہر سے دلی ریڈیو پروگراموں میں شرکت کے لئے آنے والے ہر معروف استادِ فنِ موسیقی کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ دلی گھرانے کے اساتذہ فنِ موسیقی کو مدعو کیا کرتے تاکہ باہر سے آنے والوں سے انہیں متعارف کروائیں۔

سادگی ابا کا خاصہ طبعی تھا۔ لباس، رفتار گفتار ہر بات میں اعتدال، وضعداری، حلیم طبیعت، شفقت کے ساتھ پیش آنے والے، اپنے پرائے کے دکھ میں برابر کے شریک، وقت بے وقت مدد کو تیار۔ بڑے آدمیوں سے ملنے میں انہیں پس و پیش ہوتا تھا، مگر برابر والوں اور چھوٹوں کے واسطے دامے درمے قدمے سخنے، ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ کم گوئی اُن کی خصوصیت تھی۔ خوش گفتار، ہمیشہ لئے دئے رہتے۔ بڑے بڑوں کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ شگفتہ مزاج، ظاہر و باطن ایک، وعدے کے پکے، دل کے سچے، صاف گو اتنے کہ منہ پر کہہ دیا کرتے تھے۔ قصوروار نادم ہو کر اگر معافی مانگ لیتا تو دل سے معاف کر دیتے۔ جس سے ایک دفعہ دوستی ہوئی، تمام عمر نبھایا۔ اپنی ذات سے انجمن تھے۔ جو ایک دفعہ ملتا ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ابا اپنا جما جمایا کاروبار، بینک کا روپیہ، جائیداد سب کچھ تیاگ کر بال بچوں سمیت لاہور آ گئے۔ سفر کے دوران جس قیامت سے دوچار ہوئے، اس کا حال وہ لوگ جانتے ہیں جنہوں نے خون کے آنسو رلانے

والی رپورتاژ "دلی کی بپتا" پڑھی ہوگی۔ ابا توکل کے بندے تھے۔ ذرا دل پر میل نہ آیا۔ اُن کی شگفتہ مزاجی اور وضعداری اور بھی زیادہ منور ہو گئی۔ عسرت میں بھی وہی شان بے نیازی۔ اتنے سخت امتحان سے گزرنے پر بھی رکھ رکھاؤ میں چنداں فرق نہیں آیا۔ غیرتمند ایسے کہ جب پاکستان پہنچے تو اپنے سگے بھائی، بہنوں تک کے ساتھ نہیں ٹھہرے۔ جناب ایم اسلم صاحب جو اُن کے دیرینہ نیازمند اور مخلص دوست ہیں، اُن کے دولت کدے پر قیام کیا۔ میاں صاحب نے اپنے قریب ہی محلے میں ایک مکان الاٹ کروایا تھا، اُس گھر میں اٹھ آئے۔ "ساقی" کی اشاعت کے لئے جب پنجاب حکومت سے ڈکلریشن نہیں ملا تو ناامید ہونے کے بجائے انہوں نے کراچی کا رخ کیا۔ وہاں فوراً ضروری اجازت مل گئی اور سوائے چند ماہ کی تاخیر کے "ساقی" تا دمِ حیات پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ کراچی پہنچ کر ابا عارضی طور پر اپنے ہم زلف جناب سید عبدالعزیز صاحب کے کوارٹر واقع مارٹن روڈ پر سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کوارٹرز کے پیچھے سڑک پار جو ویران علاقہ لیاری ندی تک سنسان پھیلا ہوا تھا، جدھر جھٹپٹے کے بعد جاتے خوف آتا تھا، اسی علاقے میں ایک تعمیری اسکیم کے تحت پیر الٰہی بخش کالونی کی بنیاد پڑی تھی۔ ابا نے جیسے تیسے کالونی میں زیر تعمیر دو کوارٹرز خرید لئے اور ہم سب کو ساتھ لے کر اپنے کوارٹرز میں آ کر بس گئے۔ بجلی، پانی یا گلی میں سڑک تک نہ تھی۔ بس سر کے اوپر چھت کا آسرا ہو گیا تھا۔ ابا حالات سے راضی بہ رضا ہو گئے تھے۔ اتنے شاکر اور ایسے صابر دل لے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ کیسا انقلاب آیا کہ لاکھ کے خاک ہو گئے۔ کسی کے سامنے دستِ سوال تو کجا، اپنی پریشانیاں بھی نہ ظاہر کرتے۔ طبیعت میں وہی تازگی، شگفتگی، ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم۔ توکل کے بندے ہوں تو ایسے ہوں۔ ہمیشہ کی طرح لئے دئے رہتے۔ تکلم میں وہی مٹھاس، حلاوت، خاندانی وضعداری کا پاس، ظاہر و باطن ایک، کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ کس سخت آزمادور سے گزر رہے ہیں۔

جسم سے روح کا رشتہ قائم رکھنے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر ابّا نے ساری زندگی میں پہلی بار غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا منظور کیا۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے جو روزی میسّر آئی، اس پر گزر اوقات ہونے لگی۔ اولاد کی طرح "ساقی" کو بھی پال رہے تھے۔ ادب کی خدمت اپنے فرائضِ اوّلین میں سمجھتے تھے۔ ابّا کے بقول "خدمتِ ادب خسارے کا سودا ہے" پھر بھی نقصان برداشت کرتے رہے۔ ایک دفعہ کسی دوست کے یہ کہنے پر کہ "ساقی" کے لئے اشتہارات حاصل کرنے اور انہیں شامل کرنے سے تھوڑی بہت نقصان کی تلافی ممکن ہو سکتی ہے"، ابّا ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ "تم یہ چاہتے ہو کہ میں "ساقی" کے لئے لوگوں سے جاکر بھیک مانگوں، تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ جب تک خود چلا سکتا ہوں، اُسے چلاؤں گا ورنہ اس کا "موت نمبر" شائع کر کے بند کر دوں گا۔"

ابّا کے دیرینہ ملنے والوں میں ایسے اصحاب بھی تھے جو پاکستان آنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ ملنے والوں میں اکثر ایسے بھی لوگ آتے جنہیں کام کے سلسلے میں سفارش کی ضرورت پڑتی تھی۔ ابّا سیدھے سبھاؤ، ان ضرورتمند لوگوں کے لئے خود جاکر اپنے دوستوں سے سفارش کر دیا کرتے تھے۔ مگر خود کبھی بھی حکام رسی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک موقع پر ایسی آسامی نکلی، جس کے لئے چند مخلص دوستوں نے انہیں رائے دی کہ یہ آپ کے لئے موزوں ہوگی۔ اتفاق سے اسی آسامی کے لئے ایک جاننے والے دوست نے بھی درخواست دی تھی۔ ابّا کو جب اس امر کا علم ہوا تو انہوں نے آسامی کا خیال ترک کر دیا۔ وہ آسامی ان کے جاننے والے دوست کو مل گئی۔ بے تکلف دوستوں میں سے جب کسی نے استفسار کیا تو فرمایا کہ شاید اس کو مجھ سے زیادہ ضرورت تھی اچھا ہی ہوا، اُس کا کام بن گیا۔

ابّا بہت ہی محنتی تھے۔ ریڈیو کی ملازمت سے بھرے پُرے کنبے کا اُجلا

خرچ بھلا کہاں پورا ہوتا۔ چند مخلص دوستوں کے مشورے سے ترجمے کے کام کی حامی بھر لی۔ ترجمہ کرنے پر انہیں خاص قدرت اور کمال حاصل تھا۔ بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے۔ اس دوران اگر گھر کا کوئی فرد یا باہر سے ملنے کوئی آجاتا تو پاس بٹھا لیتے۔ باتیں بھی کرتے جاتے اور ترجمہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا جاتا۔ موتیوں کی لڑی جیسی پختہ تحریر، اکاٹتے نہیں تھے، مسلسل لکھتے جاتے تھے، مسہری پر بیٹھے سامنے رکھی گول میز پر جھکے گھنٹوں کام میں منہمک رہتے تھے۔ جب انگلیاں جواب دینے لگتیں اور آنکھیں بوجھل ہو جاتیں تب کہیں جاکر ہاتھ سے قلم چھوٹتا تھا۔ ابا بڑے مستقل مزاج تھے۔ اپنے کلاسیکی موسیقی کے شوق کو انہوں نے نامساعد حالات میں بھی جاری رکھا۔ علم موسیقی انہوں نے بڑے بڑے کلاونت اور استادوں سے سیکھا سمجھا تھا۔ انتھک محنت اور ذہانت سے اس شوق کو انہوں نے کمال عروج کو پہنچا دیا۔

اپنے بیگانے سب ہی سے ابا محبت کرتے تھے۔ عزیز، اقارب، کنبے خاندان کے چھوٹے بڑے، سب کے سب اُن کے گرویدہ تھے۔ ہر ایک کی خوشی غمی، دکھ بیماری میں برابر کے شریک۔ اپنے سے چھوٹے کے یہاں بھی خود خیر صلہ کو تشریف لیجاتے۔ خاندان کے سب لوگ، مخلص دوست احباب سب ہی ان کا بے حد ادب اور لحاظ کرتے تھے۔ ابا جب کنبے والوں میں ملنے جاتے تو اکثر بچوں میں سے مجھ کو اپنے ہمراہ لیجایا کرتے تھے۔ ابا سب کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ جب کسی سے مصروفِ گفتگو ہوتے تو میں حیران ان کا منہ تکتا رہتا۔ بذلہ سنج، حاضر جواب، بات بات میں لطیفہ، سننے والا ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا۔ خود خندہ دنداں نما سے آگے نہ بڑھتے۔ نپے تلے برجستہ جملے، ملائم لہجہ۔ دلّی کی کوثر و تسنیم میں دُھلی زبان، جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ جی چاہتا تھا، ان کی باتیں ختم ہی نہ ہوں۔

ایک مرتبہ مہینے کا شروع ہو گا۔ جب ساقی کا پرچہ پریس سے چھپ کر

گھر آگیا تھا۔ ابّا فرش پر بیٹھے خریداروں اور احباب کے لئے پرچے لپیٹ رہے تھے۔ میں بھی قریب بیٹھا ان کا ہاتھ بٹانے میں مصروف تھا۔ غالباً جناب جمیل جالبی صاحب پاس ہی صوفے پر بیٹھے ابّا سے باتیں کر رہے تھے۔ جمیل صاحب نے کہا: "شاہد بھائی اس وقت آپ کی تصویر اتارنے کو جی چاہتا ہے۔" ابّا کے چہرے کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔ فرمایا! "جی ہاں۔ اور اس تصویر کے حاشئے پر یہ لکھنا مت بھولئے گا "چالیس برس ادب کی خدمت کا صلہ"۔

ایک اور موقع پر جب میرے بڑے بھائی جناب مشہود احمد، ابّا اور میں فرش پر بیٹھے "ساقی" کا سالنامہ خریداروں کے لئے باندھ رہے تھے، ہمارے سامنے اسی کمرے میں ذرا ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے منشی انوار صاحب جنہیں ہم اپنے بچپن سے دیکھتے چلے آرہے تھے، بیٹھے "ساقی" کی کتابت میں مصروف تھے اس دوران وہ ابّا سے اپنی بیوی کی بد زبانی اور بدسلوکی کی شکایتیں دہرا رہے تھے۔ ابّا رسالے کے بنڈل بھی باندھتے جاتے اور منشی جی کی باتوں پر "ہاں، ہوں" بھی کرتے جاتے۔ جب خاصی دیر تک سنتے رہے تو منشی انوار صاحب کو آہستہ سے مخاطب کرکے پوچھا! "بھئی منشی انوار! کیا تمہاری سوتیلی بیوی ہے؟"

جب سے ہوش سنبھالا، میں نے ابّا کو ایک ہی وضع کے لباس میں دیکھا۔ دلّی کٹ کے معمولی سوتی کپڑے کی شیروانی، چھوٹی موری کا لٹھے کا پاجامہ جس کی موریوں میں جالی لگی ہوئی، پاؤں میں لکھنوی سادے کام کی جوتی یا گرگابی، گلے میں ململ کا کرتہ جس کے مونڈھوں پر بیل ٹکی ہوتی۔ سونے کے بٹن، سر پر ترکی ٹوپی جو پاکستان آنے کے بعد جناح کیپ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان کی یہ وضعداری دمِ آخر تک قائم رہی۔ کھانے میں ابّا کو سلونا، بھنے گوشت کا سالن، موسمی پھل اور ترکاریاں مرغوب تھیں۔ چائے بڑے شوق سے پیتے تھے۔ جاڑوں میں نہاری بہت شوق کے ساتھ کھاتے اور احباب کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے شادی بیاہ، خوشی کی تقریب کے موقع پر دلّی کے باورچیوں کو بلوا کر کھانے پکواتے تھے۔

ابا کی خوراک بہت تھوڑی تھی۔ اکیلے شاذ و نادر ہی کھانا کھاتے۔ گھر کا کوئی فرد یا باہر سے جو بھی ملنے آیا ہو ان کے ساتھ دستر خوان پر اس کی شرکت ضروری ہو جاتی۔ کھاتے وقت ایسی نفاست کہ اگر ہاتھ کی انگلیوں سے چاول کا نوالہ بناتے تو کیا مجال کہ انگلیوں کی پور سے زیادہ کبھی ہاتھ سَن جاتا۔ کبھی میں ساتھ بیٹھا ہوتا تو جلدی جلدی اپنی پلیٹ صاف کر دیتا۔ ابا چند ہی نوالے لینے کے بعد اپنی رکابی میری جانب بڑھا دیا کرتے۔

ابا کو ہمیشہ کھانے سے زیادہ کھلا کر خوشی ہوتی تھی۔ آئے دن احباب کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ مغربی پاکستان، بنگلہ دیش یا بھارت سے جب بھی کوئی ادیب یا شاعر کراچی آتا تو ابا ان کی پذیرائی اور مقامی ادیب و شاعر احباب سے ملوانے کی خاطر دعوت ضرور کرتے تھے۔

گھر کے اندر بڑی انگنائی میں دری، چاندنی کا فرش ہوتا۔ گاؤ تکیے، خاص دان، اگلدان، غرض یوں لگتا جیسے کسی شادی یا تقریب کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ مغرب کے بعد لوگ آنے شروع ہوتے۔ مہمان خصوصی سے تعارف ہوتا، باتیں ہوتیں، اتنے میں دستر خوان پر کھانا چنا جاتا۔ سب ادھر اُدھر قرینے سے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ چہلیں ہوتیں۔ خوش گپیاں اڑتے۔ اس کے بعد چائے، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ اگر محفلِ موسیقی کا اہتمام ہوتا تو اساتذۂ فن اجلے فرش پر صدر مسند پہ آبیٹھتے۔ ساز ملائے جاتے اور رات گئے تک یہ محفل جاری ساری رہتی۔ عجیب سماں ہوتا۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے محفل برخاست ہوتی تھی۔ تمام رات جاگنے کے باوجود ابا حسبِ معمول وقت پر اٹھ جاتے۔ منہ ہاتھ دھو اور وضو کر کے نمازِ فجر پڑھتے۔ اس کے بعد ناشتے کے واسطے باہر برآمدے میں جہاں چائے بنا کر رکھ دی جاتی تھی، آبیٹھتے تھے۔ ناشتے سے فراغت پا کر ایک چائے کی پیالی اور بناتے اور اسے لئے اپنے کمرے میں مسہری پہ بیٹھ کر سامنے رکھی گول میز پہ کاغذات کے انبار میں لکھنے پڑھنے میں منہمک ہو جاتے۔

ریڈیو اسٹیشن سویرے سویرے پہنچنا ضروری نہیں ہوتا تھا، اس لئے "ساقی" کی ڈاک میں آئے ہوئے خطوط اور دیگر کاغذات نمٹانے کے بعد جایا کرتے تھے۔ عصر کے وقت تک واپس آتے تو راستے سے حلوائی کی دکان سے کچھ سلونا، میٹھا بندھوا کر لے آتے۔ ہم سب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے۔ پھر مسہری پر کچھ دیر لیٹ کر ڈاک میں آئے رسالے، کتابیں دیکھا کرتے۔ پھر اٹھ کر لکھنے لکھانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ شام کو عشا کے وقت کھانا تناول فرماتے۔ دس سوا دس بجے شام ان کے شاگرد اور کبھی چند اساتذہ موسیقی تشریف لے آتے۔ گھر کے بڑے کمرے میں جو گانے والا کمرہ ہی کہلاتا تھا، فرشی نشست ہوتی۔ شاگردوں کو سکھاتے، بتاتے اور خود بھی ریاض کیا کرتے۔ فنِ موسیقی کے نکات پر حاضر استادانِ فن سے استفادہ کرتے۔ آدھی رات کے پہر جا کر یہ مجلس برخاست ہوتی تھی۔ گانے بجانے کا یہ سلسلہ چاہے آندھی آئے، مینہہ جائے ہر روز باقاعدہ جاری رہتا، محرم اور رمضان شریف کے مہینوں کے علاوہ۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ ابا فیچر، مضمون یا ترجمے کے کام میں مصروف ہو جایا کرتے تو مجلسِ موسیقی کے اختتام پر پھر لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور پچھلی رات گئے تک بیٹھے لکھا کرتے تھے۔ ابا انتھک محنت کے عادی ہو چکے تھے۔

ابا بڑے خدا ترس آدمی تھے۔ کسی کا دکھ، پریشانی ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں ایک بزرگ ماسٹر یعقوب خاں ابا کے پاس آیا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں جب ان کی قوالی عروج پر تھی تو یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے نامی قوال مانے جاتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مستقل ہمارے گھر ہی میں رہنے لگے تھے۔ ان کی بیوی اور اکلوتا جوان بیٹا سدھار گئے تھے۔ ابا کہا کرتے تھے، یہ ضعیف ہیں، بیمار۔ گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہنے دو، حالانکہ خود اپنے بھرے پرے کنبے کیلئے تنگ جگہ ناکافی تھی۔

اسی طرح ایک ریڈیو آرٹسٹ کو بھی اجازت دیدی تھی کہ وہ چاہے تو گھر کے باہر سامنے کے احاطے میں اپنی جھونپڑی ڈال لے ــــ وہ بال بچوں سمیت جھگّی ڈال گھر کے سامنے عرصے تک رہتے رہے۔ ایک روز خدا کا کرنا کہ ایک بیمار، نادار، ضعف کے مارے بزرگ نہ جانے ڈھونڈتے ڈھانڈتے گھر کے دروازے پر تشریف لائے۔ ابّا نے باہر جاکر دیکھا، انہیں پہچان گئے۔ یہ صاحب ابّا کے ہارمونیم سکھانے والے پرانے ماسٹر بشیر تھے۔ انہیں ایسی حالت میں دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے۔ سہارا دیکر گھر کے اندر لائے۔ گانے والے بڑے کمرے میں ان کے واسطے چارپائی کا انتظام کروایا۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے گھر والوں کو تاکید فرمائی۔ پیرانہ سالی اور طویل علالت کے باعث ماسٹر بشیر صاحب زیادہ عرصے نہ جیئے ــــ اور ایک اُداس شام کو ابّا کا نام پکارتے پکارتے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ابّا ضرورتمند لوگوں کی مدد لیسے کرتے کہ سیدھے ہاتھ کی خبر اُلٹے ہاتھ کو نہیں ہوتی تھی۔ کوئی قرض لے کر اگر واپس نہ کرتا تو انہیں ذرا ملال نہ ہوتا تھا۔ اس سے ہمیشہ کی طرح شفقت اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے۔ اپنے، بیگانے سب ہی اُن کے پاس اپنا دکھ درد سنانے آتے اور خوش خوش واپس جاتے تھے۔ ادیبوں شاعروں کے ساتھ بھی یہی حسنِ سلوک رہا۔ اکثر ادیب اپنی کسی کتاب کا مسودہ دیئے بغیر پیشگی رقم مانگ کر لے جاتے ــــ ابّا مسودے کے لئے تقاضا تو کجا، پلٹ کر ادیب سے ذکر تک نہ کرتے۔ ادیبوں، شاعروں کو منہ مانگا معاوضہ دیا کرتے تھے۔ سودے بازی ان کی سرشت میں سرے سے ہی نہ تھی۔ "ساقی" کے لیے مضمون نگاروں کو پیشگی معاوضہ بھیج کر مضمون منگواتے تھے۔

ابّا کو پالتو جانوروں کا شوق نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب کسی کام کے سلسلے میں لاہور سے واپسی پر ملتان ٹھہرتے ہوئے آئے تو سب بچوں کے لئے حسبِ معمول سوغاتیں بھی لائے۔ جب میری باری آئی تو ہاتھ کے اشارے سے فرمایا: وہ

ٹوکری جو دروازے کے پاس رکھی ہے، جاؤ اٹھا لاؤ۔" میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، جب میں نے ٹوکری کا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں ایک ننّا سا کتّے کا بچہ بیٹھا پایا۔ فرمایا! اب تم اس کی دیکھ بھال کیا کرنا۔ ملتان میں ایک دیرینہ کرم فرمانے جو باغات کے مالک تھے، انگلستان سے ایک اعلیٰ کتے کا جوڑا منگوایا تھا۔ اسی ایلسیشن نسل کے جوڑے کے جب پلّے ہوئے تو ان میں سے ایک، قاضی صاحب نے چلتے وقت ابّا قبلہ کو تحفتاً پیش کیا، ساتھ کر دیا۔

عام طور پر ہمارے ہاں کتّے کو ناپاک سمجھتے ہیں، گھر کے باہر ہی رکھتے ہیں۔ اندر نہیں آنے دیتے۔ کراچی کی گرمی کے خیال سے ابّا قبلہ نے ملازم کو تاکید کی کہ کہیں اور نہیں ان کے کمرے میں مسہری کے نیچے ریت بچھا کر اوپر سے بوری ڈال کر اور باقاعدہ دن میں چھڑکاؤ کے بعد اس کتّے کے بچّے کو یہاں رکھا جائے۔ شام کو گھر کی بڑی انگنائی میں گیلی بوری پر اس کا ٹھکانا ہوا کرے گا۔ اس کے لئے دودھ راتب کے برتن وغیرہ کے واسطے سبھی ہدایات دیں۔ خود ابّا نے اس کا نام ٹائیگر تجویز فرمایا۔ ٹائیگر جب چھ ماہ کا تھا تو ایسا ادنچا بڑا ہو گیا تھا۔ اتنا خوبصورت ایلسیشن کتا کہ دیکھنے والے رشک کرتے تھے۔

میرا انگلینڈ جانے کا پروگرام اچانک طے ہو گیا۔ ابّا نے پوچھا کہ ٹائیگر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میرے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر خود ہی فرمایا۔ تم روانگی سے قبل "کتے صاحب" کو لے جا کر ڈاکٹر یاور عباس صاحب کو تحفتاً دے آنا۔ ابّا ٹائیگر کو "کتّے صاحب" کہا کرتے تھے۔ ابا کا کہنا بہت مانتا تھا۔ کیا مجال ان کے اشارے یا حکم کی تعمیل نہ کرے، چپ چاپ ان کے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ وہاں سے ہرگز نہ ہلتا مجھ سے زیادہ ابّا اس کا خیال رکھا کرتے تھے۔

انگلینڈ پہنچ کر میں برسرِ روزگار ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ تھوڑی بہت تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ابّا حاجتمند کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ ایک روز کسی خاتون نے مجھے فون کیا کہ وہ پاکستان سے بغرضِ علاج تشریف لائی ہیں۔ میرے نام ابّا کا خط بھی

ساتھ لائی ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے مجھے خط دیا۔ رقعہ میں ابا نے لکھا تھا کہ یہ خاتون پاکستان کی مایۂ ناز مغنیہ ہیں۔ اسٹیٹ بینک سے انہیں حسب ضرورت زرِمبادلہ نہیں مل سکا، تم اس کمی کی تلافی کر سکو تو ان کی مدد ہو جائیگی۔ میں نے حسبِ توفیق ان قابلِ قدر ہستی کی خدمت میں ایک چیک پیش کر دیا۔ بہت خوش ہوئیں اور بڑی دعائیں دیں۔

ایک اور موقع پر دور کے ایک عزیز کی صاحبزادی بغرضِ سیر لندن آئیں۔ میرے نام ابا کا ایک رقعہ بھی لائی تھیں۔ حسبِ ضرورت ان کے واسطے بھی رقم کا بندوبست کر دیا۔ اس کی اطلاع میں نے ابا کو بھیجی تھی — عرصہ گزر جانے کے بعد شاید خط میں ابا نے تذکرۃً لکھا تھا کہ وعدے کے مطابق ان عزیز نے وہ رقم جو تم نے ان کی دخترِ نیک اختر کو دی تھی، ہنوز نہیں ادا کی — آگے لکھا تھا۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ یہ امر اہم ہے کہ ان کی صاحبزادی کی ضرورت رفع ہو گئی — مجھے یاد نہیں کہ ابا نے اپنے واسطے بھی کچھ لکھا ہو۔ انتقال سے ایک سال پہلے جب ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا تو میں نے ڈرتے ڈرتے کچھ بھجوایا تھا۔ بوابسی ڈاک جو الطاف نامہ آیا تو مجھے سختی کے ساتھ منع کیا تھا کہ ضرورت ہو گی تو خود منگا لیا کروں گا۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کی ضرورت پوری کر کے ابا خوش ہوتے تھے۔

یادوں کا ایک سمندر ہے کہ امڈا ہی چلا آتا ہے مجھ حقیر سے جو ان کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں۔ کسی فاضلانہ مضمون یا ابا قبلہ کی ادبی حیثیت پر کوئی خالص علمی قسم کا مقالہ لکھنے کی توقع — ایسی توقعات پوری کرنے کا اہل نہیں۔ جیسا میں نے اپنے والد بزرگوار کو دیکھا، پہچانا۔ میں صرف یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ اپنے دور کی نہایت جلیل وجمیل شخصیت تھے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مالک رام

اُردو لغت

اردو لغت نویسی کا کام یورپی تاجروں اور مشنریوں نے شروع کیا تھا جب وہ یہاں آئے انہیں اپنے خیالات و افکار اور معتقدات اہلِ ہند تک پہنچانے کے لئے یہاں کی زبان سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے مختلف لغتیں مُرتب کیں۔ قدرتاً یہ لغتیں دو لسانی یا ذو لسانی تھیں، یعنی اردو اور کسی یورپی زبان سے متعلق۔ اردو/ اردو لغت کا کام بہت بعد کو شروع ہوا۔ اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی لغت کی کتابیں وجود میں آئیں لیکن اس میدان میں سب سے پہلا قابلِ لحاظ اور اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت ہی وقیع کارنامہ سیّد احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ تھی۔ ان کے بعد امیر مینائی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، لیکن امیر اللغات ان کی وفات کے باعث نامکمل رہ گئی۔ اس کا اٹھان ایسا تھا کہ اگر مکمل ہو جاتی تو بڑے کام کی چیز ثابت ہوتی۔ مدّتوں بعد مولوی نورالحسن نیّر کاکوروی کی نوراللغات شائع ہوئی جس کی الف کی تختی میں امیراللغات کی مطبوعہ جلد سے وسیع استفادہ کیا گیا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ نوراللغات کے بعد اردو لغت کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر اور مستند کام نہیں ہوا اور نوراللغات کو چھپے بھی نصف صدی سے زیادہ ہو گئی۔ زبان بڑھتی دولت ہے۔ اس میں حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے داغؔ اور امیر مینائیؔ کے کتنے الفاظ متروک ہو گئے۔

بس، بہت دن سے ایک نئی لغت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ بیس برس ہوئے، جب معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک منصوبے کے تحت یہ کام شروع

ا گیا ہے، تو سب اردو دوستوں نے اطمینان کی سانس لی۔ آج تک جتنی لغتیں
ائع ہوئی تھیں وہ بیشتر انفرادی لگن اور کوشش کا نتیجہ تھیں۔ وہ لاکھ جامع
ور مبسوط ہوں، بہر حال ان کے مرتب ان کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے
تھے اور اس سے بھی بڑھ کر پچھلے ۴۰، ۵۰ برس میں کئی اور علوم کی طرح
ذت نویسی کا فن بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اب کسی اچھی اور معیاری
غت کے لئے بعض ایسی معلومات اس کا جزو لاینفک ہو گئی ہیں، جو پہلے کسی
اہل سے قابل مرتب کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ لہٰذا جب معلوم ہوا
ر پاکستان میں باقاعدہ لغت کا دفتر قائم ہوا ہے جس میں متعدد اہلِ علم و فن
م کریں گے اور جہاں تک سرمائے کا تعلق ہے، حکومت نے پورے اخراجات
ا ذمہ داری قبول کر لی ہے، تو یقین ہوا کہ اب کے کام صحیح نہج پر ہوگا اور اُردو کے شایان شان بھی
یں کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔ اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کام کس وسیع پیمانے پر سرانجام ہوا ہے۔
الحمد للہ کہ بیس برس بعد اب "اردو لغت" کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے۔ اس
کے دیکھنے سے دیدہ و دل روشن ہو گئے۔ خدا شاہد ہے کہ یہ توقعات سے بھی کہیں
بڑھ کر نکلا۔ ٹائپ میں بڑے سائز پر، تقریباً بارہ سو صفحات میں، حرف الف
مقصورہ کی تختی ختم ہوئی ہے۔ لفظ، اس کا تلفظ، تصریفی شکل، اشتقاق، اس
سے بننے والی تراکیب، امثال، محاورے، اور استناد میں نظم و نثر کے حوالے۔
حقیقت یہ ہے کہ کام کی نوعیت اور معیار کو دیکھنے کے بعد ۲۰ برس کے
نتظار کی کلفت دور ہو گئی۔ اس کی تیاری و طباعت میں تاخیر کھل رہی تھی۔

جب یہ چھپ کر آئی، تو بے اختیار منہ سے سبحان اللہ اور الحمد للہ نکلا اور دیر آید و
درست آید کے مقولے کی تصدیق ہو گئی۔

اب ہم بلا شبہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے سامنے سر اٹھا کر
کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی جدید ترین اصولوں کے مطابق مرتب شدہ
غت موجود ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

بلقیس شاہین

اُردو لغت

اردو لغت کی (تاریخی اصول پر) اشاعت اردو میں لغت نویسی اور لسانیات کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اس لغت کی اشاعت ایک بڑا اور تاریخ ساز علمی واقعہ تھا۔ لیکن ہم نے اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی جتنی ہاکی یا کرکٹ کے میچوں کو دیتے ہیں۔ یہاں خدانخواستہ اِن کھیلوں کی تحقیر مقصود نہیں، مراد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے قومی مزاج میں اب علم کو اساسی حیثیت حاصل نہیں، اور ویسے بھی یہ بات ایک ایسی قوم کے سلسلے میں تعجب خیز نہیں جہاں خواندگی کا اوسط (تعلیم کا نہیں) صرف بیس فیصد ہو۔

اردو لغت، ترقی اردو بورڈ کراچی کا وہ منصوبہ ہے، جس کیلئے یہ بورڈ ۱۹۵۸ء میں قائم کیا گیا تھا۔ بیس سال بعد ۱۹۷۸ء میں اس لغت کی پہلی جلد جو الف مقصورہ پر مشتمل ہے شائع ہوئی۔ اِس کتاب کے مشتملات اور اندازِ لغت نویسی پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بات عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اِس لغت کا انداز پیش کش (مختلف مقاصد کیلئے مختلف ٹائپ حروف کا استعمال، تقطیع، صفحہ کا میک اپ، کاغذ اور جلد بندی) اِس لغت کے شایانِ شان ہے، اور اس لغت کی ورق گردانی ہی سے اس کی اہمیت کا قدرے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بیس (۲۰) سال کی مدت کے بعد پہلی جلد کی اشاعت کو بڑی تاخیر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تاریخی اصول پر انگریزی کی مشہور لغت "آکسفورڈ انگلش ڈکشنری" کوئی ستر (۷۰) سال میں مکمل ہوئی اور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں علم عام ہے اور اہلِ علم میں بے غرضی اور اپنی زبان سے محبت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہزاروں اہلِ علم نے آکسفورڈ لغت کے لئے مطالعہ کا کام کیا۔

ہمارے ہاں چند لوگوں کے استثناء کے ساتھ یہ کام معاوضہ لے کر کیا گیا۔ جناب ہادی حسین صدر بورڈ نے اپنے تعارف میں تفصیل سے بتایا ہے، کہ نمونہ لغت شائع ہوا، لغت کی اقساط اردو نامہ میں شائع ہوتی رہیں اور بہت کم اہلِ علم نے تبصرہ و نقد کی زحمت گوارا کی۔ لیکن پہلی جلد کی اشاعت کے ساتھ ہی، مخالفانہ تبصروں بلکہ اسکینڈل کا سلسلہ اخبارات میں شروع ہو گیا۔ تبصرہ نگاروں میں ایسے صاحبان بھی تھے جو اس لغت کے عملۂ ادارت کے ملازم رہے۔ کاش انہوں نے جس باریک بینی سے اغلاط تلاش کیں اُسی قدر محنت سے اپنے زمانۂ ملازمت میں کام کیا ہوتا۔

اردو لغت کی پہلی جلد بڑی تقطیع کے کم و بیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ لغت کے شروع میں ہادی حسین صاحب کا تعارف اور اردو لغت اور لغات نویسی کے موضوع پر بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مدیرِ اعلیٰ اردو لغت کی تحریریں شامل ہیں۔ یہ تحریریں اردو لغت نویسی کی تاریخ ہی سے پڑھنے والوں کو روشناس نہیں کراتیں بلکہ لغت نویسی کے اصولوں اور دشواریوں سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔ اردو میں جدید لغت نویسی اور جدید لسانیات کی روایت کچھ زیادہ گہری نہیں۔ اِس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہماری بیشتر لغات میں الف ممدودہ کو اردو کے پہلے حرفِ تہجی کی حیثیت حاصل ہے، حالانکہ اردو کا پہلا حرفِ تہجی الف مقصورہ ہے جس سے اردو لغت کا آغاز کیا گیا ہے۔

اِس لغت میں اشتقاق نگاری، لفظوں کی تشریح نگاری، اور مثالوں کی پیشکش میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ سنسکرت کے اشتقاق کو پیش کرنے میں بڑی مشکل دیوناگری ٹائپ کا حصول تھا اور بورڈ والوں نے اسے ممکن بنایا۔ اسی طرح ڈاکٹر شہید اللہ اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے بعد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سنسکرت اشتقاق نگاری کا مشکل کام جسطرح انجام دیا وہ قابلِ داد ہے۔ سنسکرت کے مُرکب اور مخلوط حروف کا ٹائپ دستیاب نہ ہونے کے سبب رائج املا کو ہاتھ سے لکھوا کر لغت کے آخر میں

شامل کیا گیا ہے۔

اس لغت میں مثالوں کی پیشکش کیلئے تین ادوار قائم کئے گئے ہیں، پہلا عہد ولی پر ختم ہوتا ہے، دوسرا غالب پر اور تیسرا دور غالب سے آجتک کا دور ہے۔ ہر عہد کی مثالیں مناسب طور پر درج کی گئی ہیں جن سے الفاظ کے معنیٰ کا تغیّر اور تبدل سامنے آتا ہے لیکن افسوس اس لغت کی بناء پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی لفظ پہلے پہل اردو میں کب رائج ہوا۔ مثالوں کے ادوار سے گفتگو کرتے ہوئے جناب ہادی حسین نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"سنِ تصنیف اور مصنف کے سنِ وفات میں سے جو قدیم تر ہو وہ سند کے متوازی سیدھی جانب درج کیا جائے"۔

ہم اس بیان کو سمجھنے سے قاصر رہے ہمارے خیال میں سنِ تصنیف ہمیشہ مصنف کے سنِ وفات سے قدیم تر ہوگا آب یہ الگ اور مابعد الطبیعاتی بات ہوگی کہ کوئی مصنف اپنی وفات کے بعد کسی کے خواب میں آکر اپنی کوئی کتاب "املا" کرا جائے۔ غالباً موصوف کی مراد "سنِ طباعت" یا سنِ کتابت سے ہے۔

لغت کے آخر میں چھ صفحات کا صحت نامہ ہے کسی کتاب کا مکمل صحت کے ساتھ شائع ہونا ایک ایسا خوش آئند خواب اور تمنا ہے جو شاید پوری نہ ہو سکے۔ لیکن اس قدر طویل صحت نامہ سے بچا جاسکتا ہے۔ ویسے ایک اور مسئلے کیطرف توجہ دلانا چاہوں گی وہ یہ کہ دینی الفاظ اور مختلف علوم کی اصطلاحات کی کمی بھی مجھے لغت میں محسوس ہوئی عام لغت میں اصطلاحات کی پوری تشریح تو ممکن نہیں لیکن انہیں شامل کرنا بہرحال ضروری ہے۔ اسی طرح فقہ و تفسیر اور حدیث تصوف کے الفاظ اور اصطلاحات کو اگلی جلدوں میں شامل کیا جائے اس مقصد کے حصول کیلئے ان موضوعات پر زیادہ کتابوں کا مطالعہ کرائے جائے۔

لغت کی اشاعت کے سلسلے میں، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ بیس سال کی مدت کو "بڑی تاخیر" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تاخیر ہوئی اور اس تاخیر کا سبب لغت

کے آغاز ہی میں موجود ہے۔ یہ لغت اور بورڈ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۶ء تک مدیر اعلیٰ سے محروم رہا۔ اب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب جدید لسانیات کے معتبر عالم اور جدید لغت نویسی سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے علم و تجربہ پہ یقین رکھتے ہوئے ہماری یہ اُمید انشاءاللہ غلط ثابت نہیں ہوگی کہ لغت کی اگلی جلدیں اب زیادہ تیزی کے ساتھ شائع ہو سکیں گی۔

آخر میں ایک مودبانہ مشورہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ لغت کی تمام جلدوں کی اشاعت سے پہلے اگر ایک یا دو جلدوں میں ایک مختصر لغت (اس لغت کی تلخیص) شائع کر دی جائے تو اساتذہ، طلبہ، سرکاری دفاتر اور صحافیوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو جائے۔ اور جبکہ اردو کو دفتروں اور تعلیمی اداروں میں رائج اور نافذ کرنے کی بات ہو رہی ہے اور انتظامیہ میں بھی "قومی زبان قوم کی پہچان" کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے اور جس کیلئے ایک مقتدرہ کا قیام عمل میں بھی لایا جا چکا ہے لہذا یہ ضرورت شدید سے شدید تر ہو گئی ہے۔

لغت کے آرٹ پیپر ایڈیشن کی قیمت پانچ سو روپے معیاری ایڈیشن کی قیمت تین سو روپے اور عوامی ایڈیشن کی قیمت دو سو روپے رکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تجارتی منصوبہ نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ اصل قیمت اس سے کہیں زیادہ پڑی ہوگی اس کے ساتھ جب "عوام" کا خیال آتا ہے اور ان کے وسائل کا، تو جی چاہتا ہے کہ کاش عوامی ایڈیشن کی قیمت موجودہ قیمت کی آدھی ہوتی۔ !

غلام مصطفیٰ خاں

حرفِ راز

میں نے علی گڑھ سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا اور ۱۹۳۶ء تک ایل ایل بی اور دو مضمونوں ایم اے پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ علی گڑھ میں اُس وقت تک بھائی راز مراد آبادی سے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا لیکن جب میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں استاد مقرر ہوا اور کچھ عرصے کے بعد بھائی عابد علی خاں، ناگ پور کے ایک کالج میں استاد مقرر ہوئے تو یہ برادرانہ محبت استوار ہو گئی اور پھر ہم لوگ ہمیشہ حقیقی بھائیوں کی طرح سلوک کرتے رہے۔

علی گڑھ کی زندگی بہت سی روایتوں اور یادوں کا مجموعہ ہے۔ نوجوان اور زندہ دل طلبہ کیا کچھ نہیں کرتے تھے۔ انٹروڈکشن پارٹی سرسید کی فاتحہ کے لئے چندہ MUD RIOT، تفریحی قسم کی ACTIVITY ڈائننگ ہال کی VARIETY، ناشتہ غائب کرنے کی رسم کہ ایسے ناشتے سے خون زیادہ بنتا تھا، میرس روڈ اور نمائش کی تفریحیں، داؤد خاں اسٹیشن سے منظور گڑھی اسٹیشن تک "چہل قدمی"، بحث و مباحثے میں ہوٹنگ الیکشن میں ہارے ہوئے CANVASSERS کے جنازے، بڑے بڑے لیڈروں پر بالمشافہ نکتہ چینی وغیرہ وغیرہ بکثرت ایسی روایتیں تھیں جو علی گڑھ سے مخصوص تھیں۔ بلکہ سرسید کے زمانے کا پان والا کھمانی اور فیرنی والا ممتاز جو انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے نام کی پیالیاں بیچتا تھا، ہماری دلچسپیوں کا سامان تھا۔ پھر جمیل میاں FIELDED فلٹر، ادھا، پوا TEDIOUS، برگو ناسٹر وغیرہ کیا کیا نعرے تھے جو وہاں کی فضا میں گونجتے تھے۔ لیکن ہماری زندہ دلی اور شرارت پر تہذیب و شرافت کا کنٹرول تھا اور پرنسپل عبدالمجید قریشی صاحب اور پرو وائس چانسلر "ابا حلیم" کے احتساب سے

ب اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح اپنے والدین سے ڈرا کرتے تھے۔ پھر ہماری
ستگی اور زندہ دلی کی جِلا کے لئے دوسرے اسباب و عوامل بھی تھے۔
محمد صاحب کی اصول پرستی، خاوری صاحب کی نفاست پسندی، عبدالعزیز
صاحب کی مشکل پسندی، حاذق صاحب کے لطیفے اور قہقہے، ضیا احمد
ب کی علمیت، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی تفسیر کلاس، مولانا ابو بکر
شیث صاحب کی علمی وجاہت، ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کا دینی جوش
ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا تقریری آہنگ وغیرہ کیا کچھ نہ تھا اور ان بزرگوں
جو کچھ ہمیں حاصل ہوا وہ کون فراموش کر سکتا ہے؟ مزید یہ کہ اسلامی دنیا
بہترین اذہان سے بھی ہم لوگ وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہتے تھے۔
کہ علی گڑھ کی ایسی فضا میں رہنے والا شاعر یا ادیب یا عام طالب علم بھی
سے پیچھے نہیں رہ سکتا تھا۔

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" ہماری خاص اصطلاحیں ہیں اور
جاتا ہے کہ "ادب برائے ادب" میں کوئی "زندگی" نہیں۔ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔
ب برائے ادب" ہماری جس زندگی سے عبارت ہے وہ زندگی بھی بڑی قیمتی تھی۔
غرض جو کچھ ہم نے اپنے دینی اور سیاسی دور میں حاصل کیا تھا، اُس کی جھلکیاں،
ادب میں نظر آتی ہیں۔ سر سیّد اور حالی بے شک جدید ادب اور جدید
کے بانی ہیں لیکن ان کی تحریر یا تنقید میں آج کل کی بے باکانہ تنقیص نہیں ملیگی
زبان و ادب کو بھی مؤدب اور مہذب دیکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے ہم کو
تعلیم دی تھی کہ "الطریق کلّہ ادب"۔ یہی حال اُس دَور کے ادب کا تھا جس
راز صاحب کی شاعری پروان چڑھی۔ ہم سب کے اُستاد پروفیسر رشید احمد
یقی اور مولانا احسن مارہروی، ہماری تمام ادبی اور شعری محفلوں کے روح و
ال تھے اور ان بزرگوں کی وجہ سے ملک کا کونسا شاعر تھا جو علی گڑھ نہ آتا
سیماب، نوح، اصغر، جگر، فانی، حسرت، عزیز، صفی، ثاقب، حفیظ، جوش،

ساغر وغیرہ سبھی آجاتے تھے اور خود علی گڑھ کے طلبہ میں آل احمد سرور، منظور حسین شور، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، علی سردار جعفری، اختر الایمان وغیرہ کسی نہ کسی خصوصیت کے مالک تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں جگر کا طوطی بول رہا تھا۔ اُن کی پر کیف شاعری جس پر اُن کی رندی اور مستی غالب تھی طلبہ کی روحانی غذا بن چکی تھی اور اس سے علی گڑھ کے در و دیوار گونج رہے تھے راز صاحب کو جگر سے مراد آباد اور علی گڑھ دونوں کی وجہ سے رشتہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے ۱۹۳۳ء سے باقاعدہ جگر سے استفادہ کیا اور شروع ہی سے اُن کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ اُن کا ابتدائی کلام یہ ہے :-

تجھ سے ملنے کا اک بہانہ ہے
اہلِ دنیا جسے قضا سمجھے (۱۹۳۳ء)

ہر اک پردۂ راز اٹھانا پڑے گا
مرے سامنے اُن کو آنا پڑے گا (۱۹۳۵ء)

جگر کہا کرتے تھے کہ نوجوانوں کو "بڑے میاں" والی شاعری زیب نہیں دیتی۔ اسی لئے راز صاحب نے شروع ہی سے "نوجوانوں" والی شاعری اختیار کی اور اس میں جگر کے اندازِ فکر کو بھی شامل کر لیا۔ مثلاً کہتے ہیں :-

شاید اسی کا نام کمالِ وفا ہے راز
اپنی وفا پہ آپ مٹا جا رہا ہوں میں (۱۹۳۶ء)

اُس باریابِ حسن کی افتادگی نہ پوچھ
جو گر گیا نگاہ میں رہ کر نگاہ سے (۱۹۳۸ء)

لیکن اس "باریابِ حسن" کی کامیابی کا ذکر بھی آتا ہے :-

میں نے مانا کہ گرفتارِ محبت ہوں مگر
اپنی کہئے آج آنکھوں میں نمی کاہے کو ہے (۱۹۴۰ء)

اور اس "کامیابی" کا ذکر ایک مرصع غزل میں بھی ہے جس کا مطلع ہے :-

جلوہ فرما ہے کوئی دشمن دیں آج کی رات
میرا غم خانہ ہے فردوس بریں آج کی رات (۱۹۴۲ء)

دوسرا شعر یہ ہے۔ زہرۂ و ارزو تریا رخ و کوثر چشمے
خلوت راز میں ہے کوئی حسیں آج کی رات

اس شعر کو پڑھ کر خسرو کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

جگر سے استفادہ کرنے کا اعتراف کبھی راز کو شاید اس لئے کرنا پڑا کہ حاسدوں سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ راز کہتے ہیں :۔

کم ظرف تو نہیں کہ نہ ہو اعتراف حال
فیض جگر ہے راز کہ مشہور ہو گئے (۱۹۴۳ء)

جگر کے رنگ میں پھر کئی بہت اچھی غزلیں لکھی ہیں جن کے چیدہ چیدہ اشعار یہ ہیں :۔

کوئی سجدہ، سجدۂ بے مدعا ہوتا نہیں
آدمی سے بندگی کا حق ادا ہوتا نہیں (۱۹۴۵ء)

حیات اپنی کسی کے بغیر جبر تو ہے
ابھی کچھ اور یہ تہمت اٹھا کے دیکھیں گے

پھر کہیں ذکر وفا ہو شاید
دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے

یہ کس نے لیا نام محبت
خرد کو نیند آئی جا رہی ہے

یہ سب غزلیں ۱۹۴۵ء کی ہیں اور اس کے بعد بھی جو غزلیں ہیں اُن میں بھی جگر کا رنگ کلیتہً موجود ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں :

عشق حشر آرزو ہے، آرزو مرگ حیات
ہائے وہ لذت کہ خون آرزو پینے میں ہے (۱۹۴۶ء)

ایک اور غزل میں بھی اسی آرزو کا ذکر ہے کہ :۔

وہی جنونِ تمنا، وہی بہارِ جمال
یہ کیا ستم ہے کہ پہلی سی رسم وراہ نہیں (۱۹۴۶ء)

اسی غزل میں رازؔ نے اپنی دینی محبت اور مغرب سے بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے اور یہ جذبہ انہیں ورثے میں ملا ہے۔ کہتے ہیں :۔

مدینہ قبلۂ حاجات ہے خدا کی قسم
فریب خوردۂ مغرب مری نگاہ نہیں

اسی سال رازؔ صاحب کی شادی ہوئی اور پھر پاکستان کی تشکیل کے بعد انکی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مملکتِ خداداد کی خوشی کے ساتھ قوم کی افراتفری بھی شروع ہوئی۔ رازؔ اس ابتلا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

ے
خبر اپنی نہ فکرِ دوستاں ہے
یہ دنیا جیسے بزمِ خفتگاں ہے (۱۹۴۷ء)

پھر ڈھاکے میں رہ کر یوں کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :۔

احباب خود فریب کم آمیز ہیں مگر
ہم سرزمینِ باشور کو جنت بنائیں گے (۱۹۴۸ء)

ایک اور غزل میں بھی یوں کہتے ہیں :۔

میں اپنے دیس میں پھرتا ہوں اجنبی کی طرح
کوئی ندیم تو کیا میرا ہم زباں بھی نہیں

پھر لندن میں رہ کر بھی وطن کی حالتِ زار پر آنسو بہاتے ہیں کہ :۔

وطن کی خاک سے آتی ہے بوئے خوں پیہم
کہ پاک، راہ زنوں سے یہ رہ گزر نہ ہوئی (۱۹۵۳ء)

لندن سے واپسی پر اپنی ذہنی اور قلبی کیفیات کا اظہار ایک بڑی مرصع غزل میں اس

طرح کرتے ہیں :۔

غم کہ تھا حریفِ جاں، اب حریفِ جاناں ہے
اب وہ زلف برہم ہے، اب وہ چشم گریاں ہے (۱۹۶۱ء)
وسعتوں میں دامن کی ان دنوں گریباں ہے
ہم نفس، کہیں شاید موسم بہاراں ہے

ایسی کیفیات بعد کی غزلوں میں بھی ہیں۔ پھر ۱۹۷۱ء میں جو ظلم ہماری قوم پر ہوا اس کا ذکر اس طرح آتا ہے :۔

الٰہی خیر، شکایت زباں پہ آئی ہے
اس انجمن میں جہاں جرم، لب کشائی ہے
ہر آئینے کا تقاضا، کہ دیکھتے رہیے
ہر آئینے کو مگر ذوقِ خود نمائی ہے
نہ اپنی موت پہ حاوی، نہ زیست پر قادر
وہ مشتِ خاک جسے دعویٔ خدائی ہے

اور اس کے بعد ہماری سیاست میں جو پیچ و خم آئے ہیں ان کا ذکر ایک حساس شاعر کیوں نہ کرے گا؟ رازؔ کہتے ہیں :۔

وطن میں اہلِ وطن جانتے ہیں غیر مجھے
یہ اور بات، یہاں عمر بھر رہا ہوں میں (۱۹۷۵ء)

پھر یوں بھی کہتے ہیں :۔

مری زباں، مرے لہجے پہ لوگ ہنستے ہیں
میں اجنبی ہوں، یہ احساس بار بار ہوا (۱۹۷۶ء)
ناگوار ان کو مری جراتِ گفتار سہی
بات کہنی ہے تو مخفل نہ سہی دار سہی (۱۹۷۷ء)
چلے تھے ساتھ کہ منزل شناس ہے لیکن
لٹے ہیں راہ میں، تھا میرِ کارواں رہزن (۱۹۷۷ء)

کبھی صلیب و سلاسل، کبھی سمِ قاتل
وہ کوئی دور ہو، پامالِ احتساب بنے ہم (۱۹۷۷ء)

پھر جولائی ۱۹۷۷ء کے انقلاب پر یوں کہا:-

میں وہ خود سر کہ سرِ دار بھی چپ رہ نہ سکا
میرا ہر لفظ کہ تاریخ بنا میرے بعد (۱۹۷۷ء)

اور پھر یوں بھی کہا:-

لہو میں اپنے نہائے ہوئے ہیں لالہ و گل
چمن کی خیر کہ ہر شاخِ گل صلیب لگے (۱۹۷۸ء)
تیغوں کی چھاؤں میں سرِ مقتل ہیں رقص میں
آسودگان کوچۂ جاناں کو کیا ہوا (۱۹۷۸ء)

بہر حال، غمِ یار اب غمِ زمانہ میں تبدیل ہو چکا ہے اور کائنات اب بصیرت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی ہے:-

غمِ یار سے ملا ہے یہ شعورِ عاشقانہ
غمِ یار سے ہے بڑھ کر مجھے اب غمِ زمانہ (۱۹۷۸ء)

اور یوں بھی فرماتے ہیں:-

خوشا وہ دل کہ دھڑکتا ہے دوسروں کے لئے
گراں بہا ہے یہ دولت اگرچہ کم بھی ملے (۱۹۷۸ء)

غرضکہ اس طرح حضرت رازؔ کے تغزل کا ارتقاء ہوا ہے اور اگر اُن کے فن کا کمال دیکھنا ہو تو اُن کے مجموعۂ کلام کے اُس حصے کو ملاحظہ فرمائیے جس کا عنوان "جگرِ لخت لخت" ہے اور جس کا ہر شعر ہر لحاظ سے انتخاب ہے۔ پھر چند رباعیاں، قطعات اور منظومات بھی ہیں لیکن ان سب کا لبِّ لباب اُنھی کی محبت ہے جو کائنات کا لبِّ لباب ہیں اور جن سے یہی بھیک مانگی جارہی ہے کہ:-

میری جھولی حضور بھر دیجے
دولتِ درد مانگتا ہوں میں

یونس حسنی

حرفِ راز

راز صاحب ایک باغ و بہار اور بے دھڑک شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا تعلق روہیل کھنڈ کے ایک روایتی پٹھان خاندان سے ہے۔ ایک ایسا خاندان جس میں جرأت و شجاعت، ہمت و غیرت ہی روایتی چیزیں نہ تھیں بلکہ تصوف اور شعر گوئی بھی جس کی اعلیٰ روایات کا حصہ تھا۔ راز صاحب کی شخصیت اور شاعری اپنے اس خاندانی ورثے سے مالا مال ہے۔ ان میں صاف گوئی اور بے خوفی کی وہ صفات ہیں جو تلوار ہاتھ سے جاتے رہنے کے بعد بھی ایک پٹھان زادے کو بہر حال زیب دیتی ہیں۔

تصوف سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو جو لوگ تصوف کو بطور مسلک اختیار کرتے ہیں اُن کی نسلوں میں بے نیازی، سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کی صفات اس طرح رچ بس جاتی ہیں کہ وہ فقیری میں بادشاہی کا لطف لیتے رہتے ہیں۔ اس کیفیت کو مجسم دیکھنا ہو تو راز صاحب کی شخصیت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اُن کی شعر گوئی کی ابتدا، تو مرادآباد میں ہی ہو گئی تھی مگر اس کا عہدِ شباب علی گڑھ میں ان کا دورِ طالب علمی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علی گڑھ کے طلبا میں مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، جذبی اور اختر الایمان جیسے نوجوان شامل تھے۔ راز صاحب نے ان کی موجودگی میں اپنا لوہا منوایا۔

وہ جگر کے صرف شاگرد ہی نہیں شیدا بھی ہیں اور فطری طور پر انہوں نے ابتدائی دور میں جگر سے بڑا اثر قبول کیا۔ حسنِ خیال، اور حسنِ ادا کے ساتھ ساتھ سرمستی و وجد کی وہ کیفیت جو جگر صاحب کا طرۂ امتیاز ہے، راز صاحب کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ ان کی ابتدائی غزلوں میں وہی رکھ رکھاؤ،

شائستگیٔ اظہار اور وجد و کیف کا عالم ہے جو جگر صاحب کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔

منکرِ حسن میں نہیں لیکن اسی قدر کہ بس
حسن کی وجہ دلکشی عشق کی اک نظر بھی ہے

اب مجھے رنج کیوں نہ ہو اس دلِ سوگوار سے
وہ جو تڑپ تڑپ گئے نالۂ بے قرار سے

صبحِ ازل سے تا ابد دورِ فراق الاماں
اُف کہ ٹپک پڑے نہ دل دیدۂ انتظار سے

یوں ربطِ حسن و عشق بڑھاتا چلا گیا
ہستی کو درمیاں سے ہٹاتا چلا گیا

ہر وعدہ کر کے توڑ دیا آپ نے مگر
ہر وعدہ اعتبار بڑھاتا چلا گیا

رازؔ صاحب نے جابجا اس اثر پذیری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک موقع پہ کہتے ہیں:۔

حسن کی بارگاہ میں جھوم کے رازؔ پڑھ غزل
فکرِ رسا کے ساتھ ساتھ تربیتِ جگرؔ بھی ہے

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے بلکہ حسنِ اتفاق ہے کہ رازؔ صاحب کی شعر گوئی تقریباً انہیں مراحل سے گزری جن سے ان کے استاد کی شاعری کو واسطہ رہا۔

جگرؔ صاحب غزل کے لئے حسن اور متعلقاتِ حسن کے علاوہ کسی اور موضوع کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایک عمر اسی وضعداری میں گزار دی لیکن تقسیم کے بعد بعض مسائل نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کی غزل غمِ جاناں سے نکل کر غمِ زمانہ کے اس وسیع میدان میں داخل ہوئی جس کے جگرؔ صاحب مدتوں منکر رہے تھے لیکن اس عہد میں ان کی غزلوں میں جو گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی، اس نے جگرؔ کے قد کاٹھ کو اور بڑھا دیا۔

تقریباً یہی صورتِ حال رازؔ صاحب کو پیش آئی۔ "حرفِ راز" کئی عنوانات میں بٹا ہوا ہے۔ "جہانِ رنگیں" کے تحت ان کا وہ کلام ہے جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کہا گیا۔ "خزاں کا نام بہار" تقسیم کے بعد کی غزلوں پر مشتمل ہے اور بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ اگر رازؔ صاحب صرف جہانِ رنگیں کے شاعر ہوتے تو جگر کے ایک سعادت مند شاگرد اور ایک کامیاب خوشہ چیں سے زیادہ اہمیت کے مالک نہ ہوتے لیکن جس چیز نے ان کی شاعری کی وقعت و اہمیت کو بڑھایا ہے، وہ "خزاں کا نام بہار" کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں تقسیم کے بعد کہی گئی ہیں۔ تقسیمِ ملک سے پیدا ہونے والے انسانی و نفسیاتی مسائل، رہنماؤں کی رہزنی، انسان کی کردار کشی، حکومتوں کا جبر و تشدد، حاکموں کی فرعون صفتی، نسلی، لسانی تعصبات اور ان سب سے بڑھ کر خوابوں اور حسین خوابوں کی بے تعبیری وہ مسائل ہیں جو اس عہد کی شاعری میں در آئے ہیں اور اس شاعرانہ آب و تاب اور کمالِ فن کے ساتھ در آئے ہیں کہ آج کا کوئی نقاد رازؔ صاحب کے اندازِ شعر گوئی سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ان کا لہجہ کلاسیکل، انداز شائستہ اور پُر وقار ہے لیکن اُن کے اشعار احساس کی اسی آنچ سے سلگ رہے ہیں، جو آج کی شاعری کا نعرۂ مستانہ بنی ہوئی ہے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

یہ حیرتیں بھی مقدر ہوئی تھیں میرے لئے
خزاں کا نام مرے عہد میں بہار ہوا

قصاص مانگنے نکلے تھے آج شہر کے لوگ
یہ حادثہ پسِ دیوارِ شہرِ یار ہوا

ناگوار ان کو مری جرأتِ گفتار سہی
بات کہنی ہے، تو محفل نہ سہی دار سہی

اور یہ شعر بھی دیکھئے، کیا تیور ہیں اور کیسا انداز ہے:۔

اگر تلاشِ سحر ہے تو سر اُٹھا کے چلو
کہ روشنی سی سرِ دار دیکھتا ہوں میں

کہاں کے گیت، کہاں کی غزل کہ ہم سخنو
بہت دنوں سے ہمیں جراُتِ فغاں بھی نہیں
کبھی صلیب و سلاسل کبھی سمِ قاتل
وہ کوئی دَور ہو پامالِ احتساب تھے ہم
نویدِ صبح تھے، پہلی کرن تھے سورج کی
گنہگار ہیں سرخیلِ انقلاب تھے ہم

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ شعر میں وزن و وقار معاشرتی حالات سے اثر پذیری ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ فطری صلاحیت، مشق و مداولت اور ریاض و تجربے کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن اچھی شاعری اپنے گرد و پیش سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتی۔ حرفِ راز کے دورِ آخر کا کلام بھی اپنے گرد و پیش سے متاثر ہے۔ ان اشعار میں خالص غزل کے شعر بھی موجود ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ ان میں بھی پچھلے اشعار سے زیادہ فنی رکھ رکھاؤ اور جاذبیت ہے۔

تجلیوں نے دیے سیکڑوں فریب مجھے
اسیرِ دام مری شوخیِ نظر نہ ہوئی
ٹوٹا ہوں آئینے کی طرح بزمِ دوست میں
پندارِ عشق، شوقِ فراواں کو کیا ہوا
لَو دے اٹھے ہیں دیدہ و دل فرطِ شوق سے
محرابِ زندگی میں چراغاں ہے آجکل

اس عہد کے عشقیہ اشعار میں اگرچہ وہ والہانہ پن نہیں جو شاید عنفوانِ شباب کا عطیہ ہوتا ہے مگر ان میں جو تاثر کی گہرائی ہے، وہی حاصلِ فن ہے۔ اس دور میں بعض فکری اور فلسفیانہ مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں مگر ان کی حیثیت راز صاحب کی شاعری میں بنیادی نہیں۔ غزل کا شاعر موضوعات کے معاملے میں کسی قدر ہر جائی ہوتا ہے اس لئے اس کے یہاں ہر موضوع پر اور کبھی کبھی ایک ہی موضوع پر بظاہر

متضاد انداز میں گفتگو مل جاتی ہے اور یہ کوئی تعجب یا اعتراض کی بات نہیں۔

حرفِ راز میں قطعے، رباعیاں اور نظمیں بھی ہیں لیکن غزلوں کی موجودگی میں وہ کچھ زیادہ قابلِ توجہ نہیں معلوم ہوتیں۔

حرفِ راز کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری غزل اب بھی اس لہجے سے پوری طرح آشنا ہے جس کی معنویت فی زمانہ نزاعی سمجھی جانے لگی ہے، اور یہ کہ اس لہجے میں جدید طرزِ احساس کے اظہار کا بھرپور سلیقہ موجود ہے۔ مسئلہ فنی ریاض اور فکر و نظر کی رسائی کا ہے۔

کچھ رفتار کے بارے میں

شعبۂ اُردو اور نذیر احمد ٹرسٹ کے زیر اہتمام یوم شاہد احمد دہلوی کا جلسہ تھا۔ راقم الحروف نے ناشر کی حیثیت سے شاہد بھائی کی دیانت کے چند واقعات بیان کئے۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب پروفیسر احسان رشید سابق شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی نے اس نکتہ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں ناشر کا جو روایتی کردار رہا ہے اور ہے اُس کے پیشِ نظر یہی ایک بات شاہد احمد صاحب کی عظمت کے ثبوت کے لئے کافی ہے ——— اور یہی وہ لمحہ تھا جب انہوں نے ہمیں ایک ایسی رقم عنایت فرمائی جو افراطِ زر کے اس دور میں بھی چھوٹی رقم نہیں ہے۔

رفتار کی اشاعت اُن کے اسی کرم کی عملی صورت ہے، ویسے ہماری کوشش یہی ہوگی کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

زیر نظر مجموعہ کے مضامین کے بارے میں ہمیں کچھ عرض نہیں کرنا ——— فیصلہ تو آپ کریں گے، لیکن میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ ان مضامین میں ملّی تقاضوں سے ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ادبی معیار کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ شعبہ کی بعض سرگرمیوں کا احاطہ بھی اس مجموعہ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ شاہد احمد مرحوم کے بارے میں ان کے بیٹے کا مضمون شعبہ کے جلسۂ یوم شاہد احمد میں پڑھا گیا تھا۔ "گوشہ جوہر" میں جو مضمون اور نظمیں شامل ہیں وہ شعبۂ اُردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جشنِ جوہر میں پڑھی گئی تھیں۔

رفتار اور ادب کے دوسرے مجلوں کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں اور یہ ناگزیر بات ہے، لیکن اس مجلہ میں آپ کو تازگی کے اور نئے افق کے آثار نظر آئیں

گے ـــــ مجلہ کا پہلا حصہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہمارا حقیر نذرانہ ہے اور ان شا اللہ ہم اسے جاری رکھیں گے کیونکہ وہ ہماری پہچان ہیں۔ اسی طرح ہم ہر بار اپنا ایک گوشہ کسی ادیب کے مطالعہ کے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں

پروفیسر کان کا گایا کا مضمون بھی ایک سلسلہ کی پہلی کڑی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اردو کے کسی غیر ملکی ادیب کی کوئی نہ کوئی تحریر ہر بار آپ کی خدمت میں پیش کریں۔ پروفیسر کان کا گایا کے علاوہ پروفیسر تاکیشی سوزوکی، پروفیسر رالف رسل پروفیسر شمل اور پروفیسر اسکندر باؤسانی جیسے عالم، اردو کے ادیبوں میں شامل ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ آپ "ایک کتاب دو نقاد" کے سلسلے کو پسند فرمائیں گے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ اس حصہ میں مالک رام صاحب اور پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں صاحب جیسے اکابر موجود ہیں۔

اگلے مجموعہ کیلئے ایک "مجلس مذاکرہ" کا بندوبست کیا جا رہا ہے "غزل ـــــ ایک روایت کا تنزل" کے عنوان سے ہم پروفیسر احمد علی صاحب کا ایک مقالہ ممتاز اہلِ قلم کی خدمت میں بھیج رہے ہیں تاکہ وہ اُس کی روشنی میں غزل کے بارے میں قلم اٹھائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ اُردو کی ادبی صحافت کی کو نئی جہت سے آشنا کرے گا۔

یہ ہیں ہمارے ارادے ـــــ خدا ارادہ سے عمل تک کے مرحلوں کو ہم پر آسان فرمائے ـــــ آمین

اور آخر میں ایک بات پروفیسر احسان رشید سے،

جناب مکرم! رفتار کا پہلا قدم آپ کی نذر ہے۔

اِسے قبول فرمائیے۔

ادارہ

ہمارے لکھنے والے

تابش دہلوی:۔ مسعود الحسن تابش دہلوی ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہیں۔ منشی ذکا اللہ دہلوی سے نسبی نسبت رکھتے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ نیم روز شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیر طبع ہے۔

محمد ہادی حسین:۔ پاکستان کی سول سروس کے ممتاز رکن رہے ہیں۔ آج کل ترقی اردو بورڈ کراچی کے صدر ہیں۔ "مغربی شعریات" اور "شاعری اور تخیل" ان کی معروف کتابیں ہیں۔ اسلامیات اور عمرانیات پر بھی انگریزی میں بہت کچھ لکھا ہے۔

ابوالخیر کشفی:۔ شعبۂ اردو جامعۂ کراچی میں استاد ہیں۔ کراچی یونیورسٹی سے "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک جامعہ اوساکا برائے زبانہائے خارجی میں پروفیسر رہے۔ "ہمارے عہد کا ادب اور ادیب" "جدید ادب کے دو تنقیدی مطالعے" ان کی معروف نثر کتابیں ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی مجلس نظما کے رکن ہیں۔

منظور حسین شور علیگ:۔ ناگ پور یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد مدتوں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پروفیسری کے منصب پر فائز رہے۔ آج کل جامعۂ کراچی کے شعبۂ اردو میں جز وقتی استاد ہیں۔ دو شعری مجموعے "دیوار ابد" اور "نبض دوراں" شائع ہو چکے ہیں۔ کئی مجموعے

اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

اسلم فرخی:۔ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے مولانا محمد حسین آزاد پر کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اُردو شائع کر چکی ہے۔ نیرنگ خیال اور مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابوں کے علاوہ تذکرہ ہمیشہ بہار بھی مُرتب کیا ہے۔ شعبۂ اُردو جامعۂ کراچی میں استاد ہیں۔

سحر انصاری:۔ انور مقبول سحر انصاری شعبۂ اُردو جامعۂ کراچی کے استاد ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "نمود" شائع ہو چکا ہے۔ تنقیدی مقالات کا مجموعہ زیرِ اشاعت ہے۔

شاہدہ تبسم:۔ شاہدہ تبسم نے جامعۂ کراچی سے اُردو ادبیات اور اردو لسانیات میں ایم اے کیا ہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں۔

ابواللیث صدیقی:۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مسلم یونی ورسٹی، جامعۂ پنجاب اور جامعۂ کراچی میں کم وبیش ۴۰ سال اُردو ادب اور لسانیات کی تعلیم دی ہے۔ وہ کولمبیا یونی ورسٹی میں بھی پاکستانیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ اُن کے اعلیٰ اور ممتاز تدریسی خدمات کے اعتراف کے طور پر جامعۂ کراچی نے انہیں تاحیات پروفیسر امرتیس کا اعزاز عطا کیا ہے۔ آج کل وہ ترقی اُردو بورڈ کے سکریٹری اور اُردو لغت کے مدیرِ اعلیٰ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" "آج کا اُردو ادب"، "اُدب اور لسانیات" اور "غزل و متغزلین" ان کی معروف کتابیں ہیں۔ جرأت، مصحفی اور نظیر اکبر آبادی پر بھی اُن کے مطالعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

کان کاگایا:۔ پروفیسر کان کاگایا، جامعۂ اوساکا برائے زبانہائے خارجی میں اُردو کے استاد ہیں - فارسی پر بھی عبور رکھتے ہیں اور عربی سے بھی واقف ہیں - جاپانی میں اُردو قواعد کے علاوہ پاکستان پر ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ صدر ایوب خاں مرحوم کی خود نوشت اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب "آج کا اُردو ادب" کو جاپانی زبان میں منتقل کر چکے ہیں۔ جمال الدین افغانی، سرسید، اقبال اور ایرانی تاریخ پر کئی اہم مقالے لکھ چکے ہیں۔

مسعود احمد دہلوی:۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم کے صاحبزادے ہیں لندن سے لائبریری سائنس میں اعلیٰ سند حاصل کی اور اب کنیڈا کے ایک بڑے کتب خانے سے وابستہ ہیں۔

مالک رام:۔ جناب مالک رام غالبیات پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذکرِ غالب، ان کے مرتبہ دیوان غالب اور گل رعنا کو قبول عام حاصل ہوا۔ اسلام اور عورت کے موضوع پر ان کی تصنیف اب بھی جامع ترین کتاب ہے - تذکرہ معاصرین کی کئی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ سہ ماہی تحریر کے ۴۶ شمارے ان کی ادارت میں شائع ہوئے - افسوس تحریر گذشتہ سال بند ہو گیا۔

ہندوستان کی وزارتِ خارجہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے - ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علمی کاموں میں گم ہیں - مرکزی ترقی اُردو بورڈ ہند کی لغت کے مدیروں میں سے ایک ہیں۔

پتہ - ۵۰۴ سی - ڈیفنس کالونی، نئی دھلی

بلقیس شاہین:۔ جامعۂ کراچی سے اُردو ادبیات اور اُردو لسانیات میں ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں - ایک ناول "یہ خلش کہاں سے ہوتی" شائع ہو چکا ہے - "اصطلاحات لسانیات" زیر طبع ہے۔

غلام مصطفیٰ خاں :- پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ناگ پور یونی ورسٹی کے بعد اُردو کالج کراچی اور جامعۂ سندھ حیدر آباد میں پروفیسر رہے - اب جامعۂ سندھ کے پروفیسر امرتیس ہیں - اُردو اور فارسی ادبیات کے علاوہ تصوف پر ان کے کام کو درجۂ سند حاصل ہے - ان کی کتابوں میں "علمی نقوش" اور "حالی کا ذہنی ارتقا" کو خاص شہرت حاصل ہوئی - ان کے تحریری کام پر ناگ پور یونی ورسٹی نے ڈی لٹ کا اعزاز عطا کیا -

پتہ :- ۲ اولڈ کیمپس سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد

یونس حسنی :- ڈاکٹر محمد یونس حسنی وکرم یونی ورسٹی میں اُردو کے استاد رہے - فیڈرل گورنمنٹ کالج کراچی کے پرنسپل رہے - اب شعبۂ اُردو جامعۂ کراچی میں استاد ہیں - اختر شیرانی کے حیات و شاعری پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی - ان کا تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اُردو پاکستان شائع کر چکی ہے - اختر شیرانی کی اُردو نثر پر کام مکمل کر چکے ہیں -

ادبی کتابیں

حرفِ راز:۔ راز مراد آبادی کا پہلا مجموعۂ کلام جسے شعبۂ اُردو، جامعۂ کراچی نے شائع کیا ہے۔

بصیرت اور فن کارانہ سلیقہ، ان دونوں خصوصیات کو یک جا کر کے راز مراد آبادی نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگر آدمی دل زندہ رکھتا ہو تو زمانے سے مات نہیں کھاتا۔

—— مجنوں گورکھپوری

قیمت مجلد - ۲۲ روپے　　غیر مجلد - پندرہ روپے

"اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک"

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی یہ کتاب اردو میں تحقیق اور تنقید کا ایک نیا معیار قائم کرتی ہے۔

قیمت مجلد - تیس روپے • غیر مجلد بائیس روپے

رفتار کے پڑھنے والے اگر پیشگی قیمت بھیج دیں تو پندرہ فیصد رعایت اور محصول ڈاک ہمارے ذمہ

مکتبۂ شعبۂ اردو ، جامعۂ کراچی